رجسٹرڈ ایل نمبر ٤٣٣٠

جلد ۵۵ عدد ٦

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ ، لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ٦ روپے

قیمت فی پرچہ ٦٢ پیسے

ہماری مطبوعات

منظور شدہ مطابق سرکار 601-950/T B C

مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۶۱ء

(۱) رسالہ دینیات از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ۲-۵۰ روپے
(۲) خطبات ” ۳-۲۵ ”
(۳) پردہ ” ۳-۰۰ ”
(۴) اسلام اور جدید معاشی نظریات ” ۲-۲۵ ”
(۵) ٹووررڈس انڈر سٹینڈنگ اسلام ” ۳-۵۰ ”
(Towards Understanding Islam)
(۶) توحید و رسالت اور زندگی بعد موت
کا عقلی ثبوت ” ۸۷ پیسے
(۷) اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر ” ۶۲ ”
(۸) انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل ۶۲ ”
(۹) اسلام اور جاہلیت ” ۶۲ ”
(۱۰) سلامتی کا راستہ ” ۳۱ ”
(۱۱) داعیٔ اسلام کی حیات طیبہ از مولانا عبدالحی رام پوری
۳-۷۳ روپے
(۱۲) اصلاح معاشرہ میں نماز کا مقام از چوہدری بہاول خاں ناگرہ
۱-۳۸ روپے

منظور شدہ مطابق سرکار 5046-5395/T B C

مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۶۰ء

(۱۳) نبیوں کے حالات حصہ اول از مولانا عبدالحی رامپوری ۳۱ پیسے
(۱۴) ” دوم ” ۶۲ ”
(۱۵) ” سوم ” ۶۲ ”
(۱۶) ” چہارم ” ۱-۸۸ روپے
(۱۷) اخلاقی کہانیاں حصہ اول از افضل حسین ایم اے-ایل ٹی ۳۱ پیسے
(۱۸) ” دوم ” ۳۱ ”
(۱۹) ” سوم ” ۶۲ ”
(۲۰) ” چہارم ” ۶۲ ”

اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ ۱۱-سی شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

نمبر ۶	مارچ سنہ ۱۹۶۱ء	جلد ۵۵

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن

اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پاکستان میں آزادی کی صبح نمودار ہونے کے بعد ایک مخصوص طبقے کے اندر روپے کی جو اچانک ریل پیل ہوئی ہے وہ اگر ایک نقطۂ نظر سے کسی حد تک خوش آئند ہے تو دوسرے نقطۂ نظر سے انتہائی تشویشناک بھی ہے اور یہ دوسرا پہلو اہلِ ملک کے وسیع تر مفادات کے پیشِ نظر اور خصوصًا ایک مسلم قوم کے زاویۂ نگاہ سے گہرے غور و فکر کا محتاج ہے ہم جہاں اس بات سے قدرے خوش ہیں کہ ہمارے بھائی بندوں کو آزادی کے بعد اعتماد کے ساتھ تجارت کرنے کے کچھ ڈھنگ آ گئے ہیں اور ان کی وساطت سے چند ہزار یا چند لاکھ افراد کو روزگار میسر ہوا ہے، وہاں ہمیں اس بات سے سخت پریشانی بھی لاحق ہے کہ دولت کا یہ دھارا ایک ایسی سمت میں بہنے لگا ہے جس نے قوموں کو بالعموم تباہی اور بربادی کی طرف دھکیلا ہے اور خصوصًا مسلم قوم کے لیے تو اس کا یہ رخ ہمیشہ خطرناک اور زیاں کوش ثابت ہوا ہے۔ اس نے اگر چند خوش نصیب لوگوں کی تجارتی کشتیوں کو ساحلِ مراد پہ پہنچا کر انہیں اس قابل بنایا ہے کہ وہ دادِ عیش دے سکیں تو دوسری طرف اس کی تند و تیز رو نے دین و ایمان کی کھیتیوں کو اجاڑ کر رکھ دیا ہے، اس سے اخلاق اور شرافت کے چمنستان برباد ہوتے ہیں، عفت و عصمت کے قلعوں میں شگاف پڑنے لگے ہیں اور اس کی تلاطم خیزیوں نے پوری قوم کو دو ایسے طبقات میں تقسیم کر دیا ہے جن کے درمیان بُعد ہر لمحہ بڑھتا جا رہا ہے اور اس کے دُور ہونے کی کوئی تدبیر ممکن نظر نہیں آتی الا یہ کہ خود اللہ تعالیٰ رحم فرما کر اس خلیج کو پاٹ دے۔

اس اندوہناک صورتِ حال سے یوں تو دنیا کی کوئی قوم جس کے اندر زندہ رہنے

اور ترقی کرنے کا داعیہ موجود ہو، اغماض نہیں برت سکتی کیونکہ یہ چیز قوموں کے لیے عام طور پر جان لیوا ثابت ہوتی ہے لیکن مسلم قوم کا اس صورتِ حال سے غافل رہنا انتہائی خطرناک ہے۔ یہ نہ صرف اُس کے وجود کے لیے موت اور بربادی کا پیغام ہے بلکہ اُس مقدس مشن کے لیے بھی سمِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہے جس پر امتِ مسلمہ کی فلاح و بقا کا دارومدار ہے۔ اس صورتِ حال سے تغافل ایک ایسا جرم ہے جو تاریخ میں نہ تو کبھی پہلے معاف کیا گیا ہے اور نہ کبھی معاف کیا جا سکتا ہے۔ یورپ کے اندھے مقلدین بے شک اسے ملکی ترقی اور استحکام سمجھتے رہیں لیکن فی الواقع یہ دولت و ثروت قوموں کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ اس کی عادلانہ تقسیم اور صحیح استعمال سے جہاں قوموں کا معیارِ زندگی بلند ہوتا ہے وہاں اس کی غلط تقسیم اور ناجائز استعمالات انہیں تباہی اور بربادی کی راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ مشہور مؤرخ ڈاکٹر گبن رومی قوم کے زوال پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"عیش پرستی کا یہ حال تھا کہ لوگ نکاح سے گھبراتے اور تجرّد کی زندگی کو زیادہ پسند کرتے تھے، تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کر سکیں۔ . . . جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکس میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اس زمانے کے لوگ ان آسانیوں میں رہ کر زوال کے اسباب نہ دیکھتے۔ رومی زندگی میں ایک زہر سرایت کر رہا تھا، شعراء کی لوگ غلامانہ تقلید کرتے تھے۔ جدتِ طبع ختم ہو چکی تھی اور یہ ایسا تنزل تھا جس سے ان کے جذبات پست و ذلیل اور قویٰ پژمردہ ہو گئے تھے۔"

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں صالح اقتصادی نظام کی ضرورت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے کہ ملک کے اقتصادی نظام کا اخلاقی اور مذہبی نظام سے کس قدر گہرا تعلق ہے۔ فرماتے ہیں:

"جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور دنیوی تعیش

> گو انہوں نے اپنی زندگی کا مشغلہ بنا لیا اور آخرت کو بھلا دیا اور شیطان نے ان پر غلبہ کر لیا تو اب اُن کی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہو گئے اور ان میں کا ہر شخص سرمایہ داری اور تموّل پر فخر کرنے اور اترانے لگا۔ یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہو گئے جو عیش پسندوں کو دادِ عیش دینے کے لیے عیش پسندی کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامانِ عیش مہیا کرنے کے لیے عجیب و غریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے اور قوم کے اکابر اس جدوجہد میں مشغول ہو گئے کہ اسبابِ تعیشؒ کے فراہم کرنے میں وہ کس طرح ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں حتیٰ کہ ان کے امرا اور سرمایہ داروں کے لیے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان کی کمر کا پٹکہ یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو، یا اُن کے پاس عالیشان سر بفلک محل نہ ہو جس میں پانی کے حوض، سرد و گرم حمام بے نظیر پائیں باغ ہوں اور ضرورت سے زائد نمائش کے لیے بیش قیمت سواریاں حشم و خدم اور حسین و جمیل باندیاں موجود ہوں اور صبح و شام رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں اور جام و سبو سے شرابِ ارغوانی چھلک رہی ہو اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو اور جس کا ذکر قصہ طولانی ہے

ان دو شہرہ آفاق مفکرین کے ان اقتباسات میں ہر شخص دولت کی غیر عادلانہ تقسیم اور اس کے ناجائز استعمالات کا انجام دیکھ سکتا ہے۔ اس وقت جبکہ ہم تعمیرِ نو کا عزم لیکر اٹھے ہیں ہمیں اس معاملے میں کافی احتیاط کا ثبوت دینا چاہیے کہ کہیں ہمارے قدم بھی اُن غلط راستوں پر نہ پڑ جائیں جن پر چل کر ماضی میں قومیں تباہ ہوئیں اور خاص طور پر ایک مسلم قوم کی حیثیت سے تو ہماری ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہم دنیا میں شاہد علی الناس ہیں اس بنا پر ہماری روش دوسرے

نتائج کی حامل ہے۔ ہمارے اندر فسق و فجور کا پھیلنا نہ صرف دنیا اور آخرت کا خسران ہے بلکہ دوسری اقوام کو اسلام سے برگشتہ کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ ہم اس فاسقانہ طرز زندگی کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اس زندگی کو اختیار کر لینے کے بعد ہم بھی لازمی طور پر اسی انجام بد کو پہنچیں گے جس تک کہ دنیا کی دوسری عیاش قومیں پہنچی ہیں۔ اور حشر کے دن ہم دوہرے عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔ ایک عذاب ہماری اپنی بداعمالیوں کا اور دوسرا عذاب کہ ہم نے غلط روش اختیار کر کے ہزاروں بندگان خدا کو اپنے طرز عمل سے اسلام سے متنفر کیا ہے۔

خدا کرے کہ ہم میں اپنی ان ذمہ داریوں کا جلد از جلد احساس پیدا ہو اور ہم ان فرائض سے کماحقہٗ عہدہ برا ہو سکیں جو دولت آجانے کے بعد ایک مسلم قوم پر عائد ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں قرآن مجید ہمیں سب سے پہلے اس حقیقت سے روشناس کراتا ہے کہ اگرچہ دنیا کی یہ ساری نعمتیں اور ساز و سامان ہمارے لیے پیدا کیے گئے ہیں لیکن ہم ان کے لیے پیدا نہیں کیے گئے۔ ہمارا مقصدِ حیات یہ ہے کہ ہم خداوند عالم کی عطا کردہ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا کر اس کی رضا حاصل کریں اور اس طرح آخرت میں فلاح و کامرانی کی دولت فراہم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اسے ہماری کوتاہ نظری کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (دنیا میں جو کچھ ہے سب انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے) کو تو یاد رکھا ہے مگر يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے، تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے) کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ سارا مغالطہ اسی الٹی منطق اور اصلی اسلامی منطق کے صرف ایک مقدمہ اَلدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ کو یاد رکھنے اور دوسرے وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ کو فراموش کر دینے کا ہے۔ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ اس دوسرے جزو کو ترک کر دینے سے ہمارے فکر و نگاہ کے زاویے کس حد تک غلط ہو گئے ہیں۔ ہم نے اب

زندگی کا مقصود و مطلوب صرف مال و دولت کو بنا لیا ہے اور ہم بندۂ خالق بننے کی بجائے بندۂ زر بن گئے ہیں۔

ممکن ہے کوئی صاحب ہماری ان گذارشات کو پڑھ کر یہ کہیں کہ ہم صرف مال و دولت حاصل کرتے ہیں اس کی بندگی اور اطاعت تو نہیں کرتے مگر یہ محض فریبِ نظر ہے۔ انسان خواہ زبان سے خداوند تعالیٰ کو اپنا معبود مانتا رہے لیکن ایک فرد کا اصل معبود وہی ہوتا ہے جس کے لیے وہ اپنی قیمتی سے قیمتی متاع قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ آپ اب اسی معیار کو سامنے رکھ کر ملک کی کاروباری زندگی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ملک کی ایک عظیم اکثریت صرف دولت کمانے کے چکر میں گرفتار ہے اور اس راستے میں کوئی چیز بھی اس کی مزاحم نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص یہ دیکھتا ہے کہ سمگل کرنے سے اُس کے مال میں اضافہ ہو سکتا ہے تو وہ اس غیر قانونی پیشے کو بلا تکلف اختیار کرتا ہے۔ اگر بلیک مارکیٹ سے اُس کا پیٹ بھرتا ہوا نظر آتا ہے تو وہ بادنیٰ تامل اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے اور کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ اُس کے ان انسانیت کُش اور غیر اسلامی افعال سے ملک اور قوم کا کس قدر نقصان ہو رہا ہے۔ ملک اور قوم کو بھی چھوڑیئے وہ بندۂ زر دولت کے آستانہ پر ضمیر و ایمان، اخلاق و شرافت الغرض نیکی، خدا ترسی اور انسانیت دوستی کی تمام بیش قیمت اقدار کو بلا تکلف بھینٹ چڑھاتا ہے اور اس راہ میں مکر و فریب، رشوت اور لالچ، ظلم و تعدی کے ہر بُرے سے بُرے حربے کو آزمانے سے نہیں چوکتا۔ کیا ہماری آنکھیں اس صورتِ حال کا ہر روز مشاہدہ نہیں کرتیں اور اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اگر ہم یہی کہتے رہیں کہ نہیں ہم معبود اپنے خالق کو ہی مانتے ہیں تو یہ محض ہماری ابلہ فریبی ہے۔ جو شخص مذہب، ضمیر اور اخلاق تک کو دولت کے لیے قربان کر دے۔ وہ اگر دولت کو اپنا معبود نہیں سمجھتا تو اور کیا سمجھتا ہے؟

پھر دیکھیے کہ یہ دولت جس کی اصلی و طبعی غایت تو دین و دنیا کی صلاح و فلاح میں اس کا استعمال و انفاق ہے۔ اُسے ہم نے عملاً مشکل کشا اور قاضی الحاجات بنا رکھا ہے۔ ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اگر دولت پاس ہو تو ہمیں اپنے کسی معاملے میں دشواری پیش نہ آسکے گی۔ اور یہ چیز بیماری، آزاری، بڑھاپے، معذوری اور آخرت میں، الغرض ہر حالت میں ہماری حاجت روائی کرتی رہے گی۔ قرآن مجید اسی ذہنیت کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْئًا وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۔ (آل عمران)

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، خدا کے مقابلہ میں مال اور اولاد کوئی چیز بھی ان کے کام نہیں آسکتی بالآخر ان کو جہنم کا ایندھن ہی بننا پڑے گا۔ جیسا کہ فرعون اور ان سے پہلے والوں کا حال ہوا کہ (مال و اولاد کے گھمنڈ میں) ہماری آیتوں کو جھٹلایا پس ان کو ان گناہوں کی پاداش میں آخر کار خدا نے پکڑ لیا اور خدا ایسوں کو سخت سزا دینے والا ہے۔

یہی نہیں بلکہ دنیاوی مال و متاع سے محبت کا جو رشتہ ہم نے استوار کر رکھا ہے اُس کی نوعیت پر غور کرنے کے بعد ہر شخص اس بات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ہم اس ڈھلتی چھاؤں کو اپنی حماقت سے کوئی ابدی اور غیر فانی چیز سمجھ بیٹھے ہیں۔ جمع مال کی اس دہری ضلالت کو قرآن مجید نے دو ہی بلیغ فقروں میں بیان کر دیا ہے:

اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ۔ كَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ عَلَی الْاَفْئِدَةِ۔

جو مال جمع کرتا اور اس کے حساب کتاب میں کھپتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ سدا باقی رہے گا، ایسا ہرگز نہیں بلکہ یہ شخص حطمہ میں جھونک دیا جائیگا اور جانتے ہو حطمہ کیا ہے۔ اللہ کے حکم سے سلگائی ہوئی آگ جو دلوں پر چھا جاتی ہے۔

امام راغبؒ نے مفردات میں خلود کی لغوی تصریح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

الخلود هو تبری الشیٔ عن اعتراض الفساد وبقاءُها علی الحالة التی هو علیها	خلود کے معنی ہیں کہ چیز کا خرابی سے محفوظ اپنے حال پر علیٰ حالہٖ قائم رہنا۔

قرآن مجید پھر اس امر کی بھی پوری طرح صراحت کرتا ہے کہ مال و متاع کی فراوانی ہر حال میں خیر ہی نہیں بلکہ یہ عذاب کا ذریعہ بھی ہے۔

اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّھُمْ بِہٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِیْنَ نُسَارِعُ لَھُمْ فِی الْخَیْرٰتِ بَلْ لَّا یَشْعُرُوْنَ۔ (مومنون - رکوع ۴)	ہم ان کو مال و اولاد جو دیتے چلے جاتے ہیں تو کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ اس طرح ہم ان کو جلد از جلد فائدے پہنچا رہے ہیں بلکہ یہ (احمق) سمجھتے نہیں کہ یہ دراصل ڈھیل ہے۔

سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ ایک دوسرے انداز میں اس حقیقت کو بیان فرماتا ہے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کو اس بات کی نصیحت بھی کرتا ہے کہ زر و مال کی یہ ہنہنات تمہاری نظروں کو خیرہ نہ کر دے یہ درحقیقت پرکاہ کے برابر بھی نہیں۔ یہ لوگ سخت احمق ہیں جو اپنی اس آزمائش کو فلاح و کامرانی سے تعبیر کرتے ہوئے اس پر اترا رہے ہیں۔ یہ سارا کھیل محض چند دنوں کا ہے اور جب ان کی آنکھوں سے خود فریبی کے یہ پردے ہٹ جائیں گے تو پھر انہیں معلوم ہوگا کہ وہ کس قدر دھوکے میں مبتلا رہے ہیں۔

وَلَا تُعْجِبْکَ اَمْوَالُھُمْ وَاَوْلَادُھُمْ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّعَذِّبَھُمْ بِھَا فِی الدُّنْیَا وَتَزْھَقَ اَنْفُسُھُمْ وَھُمْ کٰفِرُوْنَ (توبہ - ع ۱۱)	ان کی مال داری اور ان کی کثرتِ اولاد تم کو دھوکے میں نہ ڈالے (یہ ان کے حق میں کوئی نعمت نہیں بلکہ) اللہ نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اس مال و اولاد کے ذریعہ سے ان کو اسی دنیا میں سزا دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں

(باقی صـــ پر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

تفہیم القرآن

لُقمان

نام اس سورہ کے دوسرے رکوع میں وہ نصیحتیں نقل کی گئی ہیں جو لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو کی تھیں۔ اسی مناسبت سے اس کا نام لقمان رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مضامین پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب اسلامی دعوت کو دبانے اور روکنے کے لیے جبر و ظلم کا آغاز ہو چکا تھا اور ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے جانے لگے تھے لیکن ابھی طوفانِ مخالفت نے پوری شدت اختیار نہ کی تھی۔ اس کی نشان دہی آیت ۱۴-۱۵ سے ہوتی ہے جس میں نئے نئے مسلمان ہونے والے نوجوانوں کو بتایا گیا ہے کہ والدین کے حقوق تو بے شک خدا کے بعد سب سے بڑھ کر ہیں، لیکن اگر وہ تمہیں اسلام قبول کرنے سے روکیں اور دینِ شرک کی طرف پلٹنے پر مجبور کریں تو ان کی یہ بات ہرگز نہ مانو۔ یہی بات سورۂ عنکبوت میں بھی ارشاد ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں سورتیں ایک ہی دور میں نازل ہوئی ہیں۔ لیکن دونوں کے مجموعی انداز بیان اور مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سورۂ لقمان پہلے نازل ہوئی ہے، اس لیے کہ اس کے پس منظر میں کسی شدید مخالفت کا نشان نہیں ملتا، اور اس کے برعکس سورۂ عنکبوت کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نزول کے زمانہ میں مسلمانوں پر سخت ظلم و ستم ہو رہا تھا۔

موضوع و مضمون اس سورہ میں لوگوں کو شرک کی لغویت و نامعقولیت اور توحید کی صداقت و معقولیت سمجھائی گئی ہے، اور انہیں دعوت دی گئی ہے کہ باپ دادا

کی اندھی تقلید چھوڑ دیں، کھلے دل سے اس تعلیم پر غور کریں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم خداوند عالم کی طرف سے پیش کر رہے ہیں، اور کھلی آنکھوں سے دیکھیں کہ ہر طرف کائنات میں اور خود ان کے اپنے نفس میں کیسے کیسے صریح آثار اس کی سچائی پر شہادت دے رہے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ کوئی نئی آواز نہیں ہے جو دنیا میں، یا خود دیارِ عرب میں پہلی مرتبہ ہی اٹھی ہو اور لوگوں کے لیے بالکل نامانوس ہو۔ پہلے بھی جو لوگ علم و عقل اور حکمت و دانائی رکھتے تھے وہ یہی باتیں کہتے تھے جو آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں۔ تمہارے اپنے ہی ملک میں لقمان نامی حکیم گذر چکا ہے جس کی حکمت و دانش کے افسانے تمہارے ہاں مشہور ہیں، جس کی ضرب الامثال اور جس کے حکیمانہ مقولوں کو تم اپنی گفتگوؤں میں نقل کرتے ہو، جس کا ذکر تمہارے شاعر اور خطیب اکثر کیا کرتے ہیں۔ اب خود ہی دیکھ لو کہ وہ کس عقیدے اور کن اخلاقیات کی تعلیم دیتا تھا۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

الٓمّٓ۔ یہ کتابِ حکیم کی آیات ہیں[1]، ہدایت اور رحمت نیکوکار لوگوں کے لیے،[2]

---

[1] یعنی ایسی کتاب کی آیات جو حکمت سے لبریز ہے، جس کی ہر بات حکیمانہ ہے۔

[2] یعنی یہ آیات راہِ راست کی طرف رہنمائی کرنے والی ہیں اور خدا کی طرف سے رحمت بن کر آئی ہیں، مگر اس رحمت اور ہدایت سے فائدہ اٹھانے والے صرف وہی لوگ ہیں جو حسنِ عمل کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، جو نیک بننا چاہتے ہیں، جنہیں بھلائی کی جستجو ہے، جن کی صفت یہ ہے کہ برائیوں پر جب انہیں متنبہ کر دیا جاتے تو ان سے رک جاتے ہیں اور خیر کی راہیں جیسے ان کے سامنے کھول کر رکھ دی جائیں تو ان پر چلنے لگتے ہیں۔ رہے بدکار اور شر پسند لوگ تو وہ نہ اس رہنمائی سے فائدہ

جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت کا پورا یقین رکھتے ہیں[3]۔ یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے برسرِ ہدایت ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں[4]۔

اٹھائیں گے نہ اِس رحمت میں سے حصّہ پائیں گے۔

۳؎ یہ مراد نہیں ہے کہ جن لوگوں کو "نیکو کار" کہا گیا ہے وہ صرف اِن تین صفات کے حامل ہیں۔ بلکہ پہلے "نیکو کار" کا عام لفظ استعمال کر کے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا کہ وہ اُن تمام برائیوں سے رکنے والے ہیں جن سے یہ کتاب روکتی ہے، اور ان سارے نیک کاموں پر عمل کرنے والے ہیں جن کا یہ کتاب حکم دیتی ہے۔ پھر ان "نیکو کار" لوگوں کی تین اہم صفات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ باقی ساری نیکیوں کا دارومدار انہی تین چیزوں پر ہے۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں، جس سے خدا پرستی و خدا ترسی ان کی مستقل عادت بن جاتی ہے۔ وہ زکوٰۃ دیتے ہیں، جس سے ایثار و قربانی کا جذبہ ان کے اندر مستحکم ہوتا ہے، متاعِ دنیا کی محبت دبتی ہے اور رضائے الٰہی کی طلب ابھرتی ہے۔ اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں، جس سے ان کے اندر ذمہ داری و جواب دہی کا احساس اُبھرتا ہے، جس کی بدولت وہ اس جانور کی طرح نہیں رہتے جو چراگاہ میں چھوٹا پھر رہا ہو بلکہ اس انسان کی طرح ہو جاتے ہیں جسے یہ شعور حاصل ہو کہ میں خود مختار نہیں ہوں، کسی آقا کا بندہ ہوں اور اپنی ساری کارگزاریوں پر اپنے آقا کے سامنے مجھے جواب دہی کرنی ہے۔ ان تین خصوصیات کی وجہ سے یہ "نیکو کار" اس طرح کے نیکو کار نہیں رہتے جن سے اتفاقاً نیکی سرزد ہو جاتی ہے اور بدی بھی اسی شان سے سرزد ہو سکتی ہے جس شان سے نیکی سرزد ہوتی ہے۔ اس کے برعکس یہ خصوصیات ان کے نفس میں ایک مستقل نظامِ فکر و اخلاق پیدا کر دیتی ہیں جس کے باعث ان سے نیکی کا صدور باقاعدہ ایک ضابطہ کے مطابق ہوتا ہے اور بدی اگر سرزد ہوتی بھی ہے تو محض ایک حادثہ کے طور پر ہوتی ہے۔ کوئی گہرے محرکات ایسے نہیں ہوتے جو ان کے نظامِ فکر و اخلاق سے ابھرتے اور ان کو اپنے اقتضائے طبع سے بدی کی راہ پر لے جاتے ہوں۔

۴؎ جس زمانہ میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں اس وقت کفارِ مکہ یہ سمجھتے تھے اور علانیہ کہتے بھی تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اس دعوت کو قبول کرنے والے لوگ اپنی زندگی برباد کر رہے ہیں۔

اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے[۵] جو خرید تا ہے کلامِ دلفریب[۶] تاکہ بھٹکا دے

اس لیے حصر کے ساتھ اور پورے زور کے ساتھ فرمایا گیا کہ "یہی فلاح پانے والے ہیں" یعنی یہ برباد ہونے والے نہیں ہیں جیسا کہ تم اپنے خیال خام میں سمجھ رہے ہو بلکہ دراصل فلاح یہی لوگ پانے والے ہیں اور اس سے محروم رہنے والے وہ ہیں جنہوں نے اس راہ کو اختیار کرنے سے انکار کیا ہے۔

یہاں قرآن کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے میں وہ شخص سخت غلطی کرے گا جو فلاح کو صرف اس دنیا کی حد تک، اور وہ بھی صرف مادّی خوشحالی کے معنی میں لے گا۔ فلاح کا قرآنی تصور معلوم کرنے کے لیے حسب ذیل آیات کو تفہیم القرآن کے تشریحی حواشی کے ساتھ بغور دیکھنا چاہیے: البقرہ، آیات ۲ تا ۵۔ آلِ عمران آیات ۱۰۲، ۱۳۰، ۲۰۰۔ المائدہ، آیات ۳۵، ۹۰۔ الانعام ۲۱۔ الاعراف، آیات ۷، ۸، ۱۵۷۔ التوبہ، ۸۸۔ یونس، ۱۷۔ النحل، ۱۱۶۔ الحج، ۷۷۔ المومنون ۱، ۱۱۷۔ النور، ۵۱۔ الروم ۳۸۰۔

۵ یعنی ایک طرف تو خدا کی طرف سے یہ رحمت اور ہدایت آئی ہوئی ہے جس سے کچھ لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دوسری طرف انہی خوش نصیب انسانوں کے پہلو بہ پہلو ایسے بدنصیب لوگ بھی موجود ہیں جو اللہ کی آیات کے مقابلہ میں یہ طرزِ عمل اختیار کر رہے ہیں۔

۶ اصل الفاظ ہیں "لہو الحدیث"۔ یعنی ایسی بات جو آدمی کو اپنے اندر مشغول کرکے ہر دوسری چیز سے غافل کر دے۔ لغت کے اعتبار سے تو ان الفاظ میں کوئی ذم کا پہلو نہیں ہے لیکن استعمال میں ان کا اطلاق بُری اور فضول اور بیہودہ باتوں پر ہی ہوتا ہے، مثلاً گپ، خرافات، ہنسی مذاق، داستانیں، افسانے اور ناول، گانا بجانا، اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔

لہو الحدیث "خریدنے" کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ وہ شخص حدیث حق کو چھوڑ کر حدیث باطل کو اختیار کرتا ہے اور ہدایت سے منہ موڑ کر ان باتوں کی طرف راغب ہوتا ہے جن میں اس کے لیے نہ دنیا میں کوئی بھلائی ہے نہ آخرت میں۔ لیکن یہ مجازی معنی ہیں۔ حقیقی معنی اس فقرے کے یہی ہیں کہ آدمی اپنا مال صرف کرکے کوئی بیہودہ چیز خریدے۔ اور بکثرت روایات بھی اسی تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔ ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کی روایت نقل کی ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کفارِ مکہ کی ساری کوششوں کے باوجود پھیلتی چلی

لوگوں کو اللہ کے راستہ سے علم کے بغیر، اور مذاق بنا دے اِن آیات[۵] کا، ایسے لوگوں

جارہی تھی تو نضر بن حارث نے قریش کے لوگوں سے کہا کہ جس طرح تم اس شخص کا مقابلہ کر رہے ہو اس سے کام نہ چلے گا۔ یہ شخص تمہارے درمیان بچپن سے ادھیڑ عمر کو پہنچا ہے۔ آج تک وہ اپنے اخلاق میں تمہارا سب سے بہتر آدمی تھا۔ سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑھ کر امانت دار تھا۔ اب تم کہتے ہو کہ وہ کاہن ہے، ساحر ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ آخر ان باتوں کو کون باور کرے گا۔ کیا لوگ ساحروں کو نہیں جانتے کہ وہ کس قسم کی جھاڑ پھونک کرتے ہیں؟ کیا لوگوں کو معلوم نہیں کہ کاہن کس قسم کی باتیں بنایا کرتے ہیں؟ کیا لوگ شعر و شاعری سے ناواقف ہیں؟ کیا لوگوں کو جنون کی کیفیات کا علم نہیں ہے؟ ان الزامات میں سے آخر کونسا الزام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر چسپاں ہوتا ہے کہ اس کا یقین دلا کر تم عوام کو اُس کی طرف توجہ کرنے سے روک سکو گے۔ ٹھیرو، اس کا علاج میں کرتا ہوں۔ اس کے بعد وہ مکّہ سے عراق گیا اور وہاں سے شاہانِ عجم کے قصے اور رستم و اسفندیار کی داستانیں لاکر اس نے قصہ گوئی کی محفلیں برپا کرنی شروع کر دیں تاکہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹے اور وہ ان کہانیوں میں کھو جائیں (سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۲۰-۳۲۱)۔ یہی روایت اسباب النزول میں واحدی نے کلبی اور مُقاتل سے نقل کی ہے۔ اور ابن عباسؓ نے اس پر مزید یہ اضافہ کیا ہے کہ نضر نے اس مقصد کے لیے گانے والی لونڈیاں بھی خریدی تھیں۔ جس کسی کے متعلق وہ سنتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں سے متأثر ہو رہا ہے اس پر اپنی ایک لونڈی مسلط کر دیتا اور اس سے کہتا کہ اسے خوب کھلا پلا اور گا نا سنا تاکہ تیرے ساتھ مشغول ہو کر اس کا دل اُدھر سے ہٹ جائے۔ یہ قریب قریب وہی چال تھی جس سے قوموں کے اکابر مجرمین ہر زمانے میں کام لیتے رہے ہیں۔ وہ عوام کو کھیل تماشوں اور رقص و سرود (کلچر) میں غرق کر دینے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ انہیں زندگی کے سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنے کا ہوش ہی نہ رہے اور اس عالمِ مستی میں ان کو سرے سے یہ محسوس ہی نہ ہونے پائے کہ انہیں کس تباہی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔

لہو الحدیث کی یہی تفسیر بکثرت صحابہ و تابعین سے منقول ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا کہ اس آیت میں لہو الحدیث سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے تین مرتبہ زور دے کر فرمایا ھو واللّٰہ الغناء "خدا کی قسم اس سے مراد گانا ہے" (ابن جریر، ابن ابی شیبہ، حاکم، بیہقی)۔ اسی سے ملتے جلتے اقوال حضرات عبداللہ

بن عباسؓ، جابر بن عبداللہ، مجاہد، عکرمہ، سعید بن جُبیر، حسن بصری اور مکحول سے مروی ہیں۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ترمذی نے حضرت ابواُمامہ باہلی کی یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا یحل بیع المغنیات ولا شراؤھن ولا التجارۃ فیھن ولا اثما نھن "مغنیہ عورتوں کا بیچنا اور خریدنا اور ان کی تجارت کرنا حلال نہیں ہے اور نہ ان کی قیمت لینا حلال ہے"۔ ایک دوسری روایت میں آخری فقرے کے الفاظ یہ ہیں اکل ثمنھن حرام "ان کی قیمت کھانا حرام ہے"۔ ایک اور روایت انہی ابوامامہؓ سے ان الفاظ میں منقول ہے کہ لا یحل تعلیم المغنیات ولا بیعھن ولا شراؤھن وثمنھن حرام "لونڈیوں کو گانے بجانے کی تعلیم دینا اور ان کی خرید و فروخت کرنا حلال نہیں ہے، اور ان کی قیمت حرام ہے"۔ ان تینوں حدیثوں میں یہ صراحت بھی ہے کہ آیت مَنۡ یَّشۡتَرِیۡ لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ انہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ قاضی ابوبکر ابن العربی "احکام القرآن" میں حضرت عبداللہ بن مبارک اور امام مالک کے حوالہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من جلس الی قینۃ یسمع منھا صُبّ فی اذنیہ الآنک یوم القیٰمۃ "جو شخص گانے والی لونڈی کی مجلس میں بیٹھ کر اس کا گانا سنے گا قیامت کے روز اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا"۔ (اس سلسلے میں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ اُس زمانے میں گانے بجانے کی "ثقافت" تمام تر، بلکہ کلیتہً لونڈیوں کی بدولت زندہ تھی۔ آزاد عورتیں اس وقت تک "آرٹسٹ" نہ بنی تھیں۔ اسی لیے حضورؐ نے مغنّیات کی بیع و شرا کا ذکر فرمایا اور ان کی فیس کو قیمت کے لفظ سے تعبیر کیا اور گانے والی خاتون کے لیے قَیۡنَہ کا لفظ استعمال کیا جو عربی زبان میں لونڈی کے لیے بولا جاتا ہے۔)

ﮯ "علم کے بغیر" کا تعلق "خریدتا ہے" کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور "بھٹکا دے" کے ساتھ بھی۔ اگر اس کا تعلق پہلے فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ جاہل و نادان آدمی اس دل فریب چیز کو خریدتا ہے اور کچھ نہیں جانتا کہ کیسی قیمتی چیز کو چھوڑ کر وہ کس تباہ کن چیز کو خرید رہا ہے۔ ایک طرف حکمت اور ہدایت سے لبریز آیات الٰہی ہیں جو مفت اسے مل رہی ہیں مگر وہ ان سے منہ موڑ رہا ہے، دوسری طرف یہ بیہودہ چیزیں ہیں جو فکر و اخلاق کو غارت کر دینے والی ہیں اور وہ اپنا مال خرچ کر کے انہیں حاصل کر رہا ہے۔ اور

کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔[۹] اُسے جب ہماری آیات سُنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رُخ پھیر لیتا ہے گویا کہ اس نے انہیں سنا ہی نہیں، گویا کہ اس کے کان بہرے ہیں۔ اچھا، مژدہ سنا دو اسے ایک دردناک عذاب کا۔ البتہ جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں، اُن کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں۔[۱۰] جن میں وہ ہمیشہ

اگر اسے دوسرے فقرے سے متعلق سمجھا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ وہ علم کے بغیر لوگوں کی رہنمائی کرنے اٹھا ہے، اسے یہ شعور نہیں ہے کہ خلقِ خدا کو راہِ خدا سے بھٹکانے کی کوشش کر کے وہ کتنا بڑا مظلمہ اپنی گردن پر لے رہا ہے۔

۸ یعنی یہ شخص لوگوں کو قصے کہانیوں اور گانے بجانے میں مشغول کر کے اللہ کی آیات کا منہ چڑانا چاہتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ قرآن کی اس دعوت کو ہنسی ٹھٹھوں میں اُڑا دیا جائے۔ یہ خدا کے دین سے لڑنے کے لیے کچھ اس طرح کا نقشۂ جنگ جمانا چاہتا ہے کہ اِدھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کی آیات سنانے نکلیں، اُدھر کہیں کسی خوش اندام و خوش گلو مغنیہ کا مجرا ہو رہا ہو، کہیں کوئی چرب زبان قصہ گو ایران تو ران کی کہانیاں سنا رہا ہو، اور لوگ ان کلچرل پروگراموں میں غرق ہو کر اس موڈ ہی میں نہ رہیں کہ خدا اور آخرت اور اخلاق کی باتیں انہیں سنائی جا سکیں۔

۹ یہ سزا ان کے جرم کی مناسبت سے ہے۔ وہ خدا کے دین اور اس کی آیات اور اس کے رسول کی تذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ خدا اس کے بدلے میں ان کو سخت ذلت کا عذاب دیگا۔

۱۰ یہ نہیں فرمایا کہ ان کے لیے جنت کی نعمتیں ہیں، بلکہ فرمایا یہ ہے کہ ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں۔ اگر پہلی بات فرمائی جاتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ ان نعمتوں سے لطف اندوز تو ضرور ہونگے مگر وہ جنتیں ان کی اپنی نہ ہونگی۔ اس کے بجائے جب یہ فرمایا گیا کہ "ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں" تو اس سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پوری پوری جنتیں ان کے حوالہ کر دی جائیں گی اور وہ اُن کی نعمتوں سے اس طرح مستفید ہوں گے جس طرح ایک مالک اپنی چیز سے مستفید ہوتا ہے، نہ کہ اُس طرح جیسے کسی کو حقوقِ ملکیت دیئے بغیر محض ایک چیز سے فائدہ اٹھانے کا موقع دے دیا جاتا ہے۔

رہیں گے۔ یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے [۱]۔

اللہ [۲] نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں [۳]۔ اس نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تاکہ وہ تمہیں لیکر ڈھلک نہ جائے [۴]۔ اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں

---

[۱] یعنی کوئی چیز اس کو اپنا وعدہ پورا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اور وہ جو کچھ کرتا ہے ٹھیک حکمت اور عدل کے تقاضوں کے مطابق کرتا ہے۔ "یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے" کہنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی ان دو صفات کو بیان کرنے کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ تو بالارادہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے اور نہ اس کائنات میں کوئی طاقت ایسی ہے جو اس کا وعدہ پورا ہونے میں مانع ہو سکتی ہو۔ اس لیے اس امر کا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا کہ ایمان و عمل صالح کے انعام میں جو کچھ اللہ نے دینے کا وعدہ فرمایا ہے وہ کسی کو نہ ملے۔ نیز یہ کہ اللہ کی طرف سے اس انعام کا اعلان سراسر اس کی حکمت اور اس کے عدل پر مبنی ہے۔ اس کے ہاں کوئی غلط بخشی نہیں ہے کہ مستحق کو محروم رکھا جائے اور غیر مستحق کو نواز دیا جائے۔ ایمان و عمل صالح سے متصف لوگ فی الواقع اس انعام کے مستحق ہیں اور اللہ یہ انعام انہی کو عطا فرمائے گا۔

[۲] اوپر کے تمہیدی فقروں کے بعد اب اصل مدعا، یعنی تردید شرک اور دعوت توحید پر کلام شروع ہوتا ہے۔

[۳] اصل الفاظ ہیں بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ "تم دیکھ رہے ہو کہ وہ بغیر ستونوں کے قائم ہیں"۔ دوسرا مطلب یہ کہ "وہ ایسے ستونوں پر قائم ہیں جو تم کو نظر نہیں آتے"۔ ابن عباس اور مجاہد نے یہی دوسرا مطلب لیا ہے۔ اور بہت سے دوسرے مفسرین پہلا مطلب لیتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے علوم طبیعی کے لحاظ سے اگر اس کا مفہوم بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام عالم افلاک میں یہ بے حد و حساب عظیم الشان تارے اور سیارے اپنے اپنے مقام و مدار پر غیر مرئی سہاروں سے قائم کیے گئے ہیں۔ کوئی تار نہیں ہیں جنہوں نے ان کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا ہو۔ کوئی سلاخیں نہیں ہیں جو ان کو ایک دوسرے پر گر جانے سے روک رہی ہوں۔ صرف قانون جذب و کشش ہے جو اس نظام کو تھامے ہوئے ہے۔ یہ تعبیر ہمارے آج کے علم کے لحاظ سے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل ہمارے علم میں کچھ اور اضافہ ہو اور اس سے

پھیلا دیئے اور آسمان سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اُگا دیں۔ یہ تو ہے اللہ کی تخلیق، اب ذرا مجھے دکھاؤ، اِن دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟[۱۵] ۔ ۔ ۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔[۱۶] ع۱

ہم[۱۷] نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار ہو۔ جو کوئی شکر کرے اُس کا شکر اُس کے

زیادہ لگتی ہوئی کوئی دوسری تعبیر اس حقیقت کی کی جاسکے۔

۱۴؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد ۲، صفحہ ۵۳۰، حاشیہ نمبر ۱۲۔

۱۵؎ یعنی اُن ہستیوں نے جن کو تم اپنا معبود بناتے بیٹھے ہو، جنہیں تم اپنی قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھ رہے ہو، جن کی بندگی بجالانے پر تمہیں اتنا اصرار ہے۔

۱۶؎ یعنی جب یہ لوگ اللہ کے سوا اس کائنات میں کسی دوسرے کی تخلیق کی کوئی نشان دہی نہیں کرسکتے، اور ظاہر ہے کہ نہیں کرسکتے، تو اِن کا غیر خالق ہستیوں کو خدائی میں شریک ٹھہرانا اور ان کے آگے سر نیاز جھکانا اور ان سے دعائیں مانگنا اور حاجتیں طلب کرنا، بجز اس کے کہ صریح بے عقلی ہے اور کوئی دوسری تاویل ان کے اس احمقانہ فعل کی نہیں کی جاسکتی۔ جب تک کوئی شخص بالکل ہی نہ بہک گیا ہو اس سے اتنی بڑی حماقت سرزد نہیں ہوسکتی کہ آپ کے سامنے وہ خود اپنے معبودوں کے غیر خالق ہونے اور صرف اللہ ہی کے خالق ہونے کا اعتراف کرے اور پھر بھی انہیں معبود ماننے پر مُصر رہے۔ کسی کے بھیجے میں ذرہ برابر بھی عقل ہو تو وہ لامحالہ یہ سوچے گا کہ جو کسی چیز کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے، اور جس کا زمین و آسمان کی کسی شے کی تخلیق میں برائے نام بھی کوئی حصّہ نہیں ہے، وہ آخر کیوں ہمارا معبود ہو؟ کیوں ہم اس کے آگے سجدہ ریز ہوں یا اس کی قدم بوسی و آستانہ بوسی کرتے پھریں؟ کیا طاقت اس کے پاس ہے کہ وہ ہماری فریاد رسی اور حاجت روائی کرسکے؟ بالفرض وہ ہماری دعاؤں کو سنتا بھی ہو تو ان کے جواب میں وہ خود کیا کارروائی کرسکتا ہے جبکہ وہ کچھ بنانے کے اختیارات رکھتا ہی نہیں؟ بگڑی تو وہی بنائے گا جو کچھ بنا سکتا ہو نہ کہ وہ جو کچھ بھی نہ بنا سکتا ہو۔

۱۷؎ شرک کی تردید میں ایک پُرزور عقلی دلیل پیش کرنے کے بعد اب عرب کے لوگوں کو یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ معقول بات آج کوئی پہلی مرتبہ تمہارے سامنے پیش نہیں کی جارہی ہے بلکہ پہلے بھی عاقل

دانا لوگ یہی بات کہتے رہے ہیں۔ اور تمہارا اپنا مشہور حکیم، لقمان اب سے بہت پہلے یہی کچھ کہہ گیا ہے اس لیے تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر شرک کوئی نامعقول عقیدہ ہے تو پہلے کسی کو یہ بات کیوں نہ سوجھی۔

لقمان کی شخصیت عرب میں ایک حکیم و دانا کی حیثیت سے بہت مشہور تھی۔ شعرائے جاہلیت مثلاً امرؤ القیس، لَبید، اعشیٰ، طَرَفہ وغیرہ کے کلام میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اہلِ عرب میں بعض پڑھے لکھے لوگوں کے پاس صحیفۂ لقمان کے نام سے ان کے حکیمانہ اقوال کا ایک مجموعہ بھی موجود تھا۔ چنانچہ روایات میں آیا ہے کہ ہجرت سے تین سال پہلے مدینہ کا اولین شخص جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متاثر ہوا وہ سُوَید بن صامت تھا۔ وہ حج کے لیے مکہ گیا تھا۔ وہاں حضورؐ اپنے قاعدے کے مطابق مختلف علاقوں سے آئے ہوئے حاجیوں کی قیام گاہوں پر جا جا کر دعوتِ اسلام دیتے پھر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں سُوَید نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سنی تو اس نے آپ سے عرض کیا کہ آپ جو باتیں پیش کر رہے ہیں ایسی ہی ایک چیز میرے پاس بھی ہے۔ آپ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا مجلّۂ لقمان۔ پھر آپ کی فرمائش پر اس نے اس مجلّہ کا کچھ حصہ آپ کو سنایا۔ آپ نے فرمایا یہ بہت اچھا کلام ہے، مگر میرے پاس ایک اور کلام اس سے بھی بہتر ہے۔ اس کے بعد آپ نے اسے قرآن سنایا اور اس نے اعتراف کیا کہ یہ بلاشبہ مجلّۂ لقمان سے بہتر ہے۔ (سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۶۷-۶۹۔ اُسد الغابہ ج ۲، صفحہ ۳۷۸)

تاریخی اعتبار سے لقمان کی شخصیت کے بارے میں بڑے اختلافات ہیں۔ جاہلیت کی تاریک صدیوں میں کوئی مدوّن تاریخ تو موجود نہ تھی۔ معلومات کا انحصار ان سینہ بسینہ روایات پر تھا جو سینکڑوں برس سے چلی آرہی تھیں۔ ان روایات کی رو سے بعض لوگ لقمان کو قومِ عاد کا ایک فرد اور یمن کا ایک بادشاہ قرار دیتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے انہی روایات پر اعتماد کر کے ارض القرآن میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ قومِ عاد پر خدا کا عذاب آنے کے بعد اس قوم کے جو اہلِ ایمان حضرت ہودؑ کے ساتھ بچ رہے تھے، لقمان انہی کی نسل سے تھا اور یمن میں اس قوم نے جو حکومت قائم کی تھی، یہ اس کے بادشاہوں

میں سے ایک تھا۔ لیکن دوسری روایات جو بعض اکابر صحابہ و تابعین سے مروی ہیں اس کے بالکل خلاف ہیں ابن عباس کہتے ہیں کہ لقمان ایک حبشی غلام تھا۔ یہی قول حضرت ابو ہریرہؓ، مجاہد، عکرمہ اور خالد الربعی کا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کا بیان ہے کہ وہ نُوبہ کا رہنے والا تھا۔ سعید بن مسیّب کا قول ہے کہ وہ مصر کے سیاہ رنگ لوگوں میں سے تھا۔ یہ تینوں اقوال قریب قریب متشابہ ہیں۔ کیونکہ عرب کے لوگ سیاہ رنگ لوگوں کو اُس زمانہ میں عموماً حبشی کہتے تھے، اور نُوبہ اس علاقے کا نام ہے جو مصر کے جنوب اور سوڈان کے شمال میں واقع ہے۔ اس لیے تینوں اقوال میں ایک شخص کو مصری، نُوبی اور حبشی قرار دینا محض لفظی اختلاف ہے معنی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر روض الانف میں سُہیلی اور مُروج الذّہب میں مسعودی کے بیانات سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس سوڈانی غلام کی باتیں عرب میں کیسے پھیلیں۔ ان دونوں کا بیان ہے کہ یہ شخص اصلاً نوبی تھا۔ لیکن باشندہ مدین اور ایلہ (موجودہ عقبہ) کے علاقے کا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی زبان عربی تھی اور اس کی حکمت عرب میں شائع ہوئی۔ مزید براں سُہیلی نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ لقمان حکیم اور لقمان بن عاد دو الگ الگ اشخاص ہیں۔ ان کو ایک شخصیت قرار دینا صحیح نہیں ہے (روض الانف ج ۱ ص ۲۶۶ مسعودی ج ۱ ص ۵۷)۔

یہاں اس بات کی تصریح بھی ضروری ہے کہ مستشرق دیرنبورگ (DERENBOURG) نے پیرس کے کتب خانہ کا ایک عربی مخطوطہ جو "امثالِ لقمان الحکیم" (FABLES DE LOQMAN LE SAGE) کے نام سے شائع کیا ہے وہ حقیقت میں ایک موضوع چیز ہے جس کا کوئی لقمان سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ یہ امثال تیرھویں صدی عیسوی میں کسی شخص نے مرتب کی تھیں۔ اس کی عربی بہت ناقص ہے، اور اسے پڑھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ دراصل کسی اور زبان کی کتاب کا ترجمہ ہے جسے مصنف یا مترجم نے اپنی طرف سے لقمان حکیم کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مستشرقین اس قسم کی جعلی چیزیں نکال نکال کر جس مقصد کے لیے سامنے لاتے ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کسی طرح قرآن کے بیان کردہ قصوں کو غیر تاریخی افسانے ثابت کر کے ساقط الاعتبار ٹھیرا دیا جائے۔ جو شخص بھی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں "لقمان" کے عنوان پر ہیلر (B. HELLER) کا مضمون پڑھے گا اس سے ان لوگوں کی نیت کا حال مخفی نہ رہے گا۔

۴۱۔ یعنی اللہ کی بخشی ہوئی اس حکمت و دانائی اور بصیرت و فرزانگی کا اوّلین تقاضا یہ تھا کہ انسان اپنے

اپنے ہی لیے مفید ہے۔ اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔[۱۱]

یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا "بیٹا، خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا،[۱۲] حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے"[۱۳]۔ اور[۱۴] یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو

رب کے مقابلے میں شکر گزاری و احسان مندی کا رویہ اختیار کرے نہ کہ کفرانِ نعمت اور نمک حرامی کا۔ اور اس کا یہ شکر محض زبانی جمع خرچ ہی نہ ہو بلکہ فکر اور قول اور عمل، تینوں صورتوں میں ہو۔ وہ اپنے قلب و ذہن کی گہرائیوں میں اس بات کا یقین و شعور بھی رکھتا ہو کہ مجھے جو کچھ نصیب ہے خدا کا دیا ہوا ہے۔ اس کی زبان اپنے خدا کے احسانات کا ہمیشہ اعتراف بھی کرتی رہے۔ اور وہ عملاً بھی خدا کی فرمانبرداری کرکے، اس کی معصیت سے پرہیز کرکے اس کی رضا کی طلب میں دوڑ دھوپ کرکے، اس کے دیئے ہوئے انعامات کو اس کے بندوں تک پہنچا کر، اور اس کے خلاف بغاوت کرنے والوں سے مجاہدہ کرکے یہ ثابت کر دے کہ وہ فی الواقع اپنے خدا کا احسان مند ہے۔

[۱۱] یعنی جو شخص کفر کرتا ہے اس کا کفر اس کے اپنے لیے نقصان دہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ وہ بے نیاز ہے، کسی کے شکر کا محتاج نہیں ہے۔ نہ کسی کا شکر اس کی خدائی میں کوئی اضافہ کرتا ہے اور نہ کسی کا کفر اس امر واقعہ کو بدل سکتا ہے کہ بندوں کو جو کچھ بھی نصیب ہے اسی کا عطا کردہ ہے۔ وہ تو آپ سے آپ محمود ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے کمال و جمال اور اس کی خلاقی و رزاقی پر شہادت دے رہا ہے اور ہر مخلوق زبانِ حال سے اس کی حمد بجا لا رہی ہے۔

[۱۲] لقمان کی حکیمانہ باتوں میں سے اِس خاص نصیحت کو دو مناسبتوں کی بنا پر یہاں نقل کیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ انہوں نے یہ نصیحت اپنے بیٹے کو کی تھی اور ظاہر بات ہے کہ آدمی دنیا میں سب سے بڑھ کر اگر کسی کے حق میں مخلص ہو سکتا ہے تو وہ اس کی اپنی اولاد ہی ہے۔ ایک شخص دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے، ان سے منافقانہ باتیں کر سکتا ہے، لیکن اپنی اولاد کو تو ایک بُرے سے بُرا آدمی بھی فریب دینے کی کوشش کبھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے لقمان کا اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کرنا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان کے نزدیک شرک ایک بدترین فعل تھا اور اسی بنا پر انہوں نے سب سے پہلے جس چیز کی اپنے لختِ جگر کو تلقین کی وہ یہ تھی کہ اس

اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔[۲۳] (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت

گمراہی سے اجتناب کرے۔ دوسری مناسبت اس حکایت کی یہ ہے کہ کفارِ مکہ میں سے بہت سے ماں باپ اُس وقت اپنی اولاد کو دینِ شرک پر قائم رہنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید سے منہ موڑ لینے پر مجبور کر رہے تھے، جیسا کہ آگے کی آیات بتا رہی ہیں۔ اس لیے ان نادانوں کو سنایا جا رہا ہے کہ تمہاری سرزمین کے مشہور حکیم نے تو اپنی اولاد کی خیر خواہی کا حق یوں ادا کیا تھا کہ اسے شرک سے پرہیز کرنے کی نصیحت کی۔ اب تم جو اپنی اولاد کو اسی شرک پر مجبور کر رہے ہو تو یہ ان کے ساتھ بدخواہی ہے یا خیر خواہی؟

۲۱ ظلم کے اصل معنی ہیں کسی کا حق مارنا اور انصاف کے خلاف کام کرنا۔ شرک اس وجہ سے ظلمِ عظیم ہے کہ آدمی اُن ہستیوں کو اپنے خالق اور رازق اور منعم کے برابر لا کھڑا کرتا ہے جن کا نہ اس کے پیدا کرنے میں کوئی حصہ، نہ اس کو رزق پہنچانے میں کوئی دخل، اور نہ اُن نعمتوں کے عطا کرنے میں کوئی شرکت جن سے آدمی اس دنیا میں متمتع ہو رہا ہے۔ یہ ایسی بے انصافی ہے جس سے بڑھ کر کسی بے انصافی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ پھر آدمی پر اس کے خالق کا یہ حق ہے کہ وہ صرف اسی کی بندگی و پرستش کرے، مگر وہ دوسروں کی بندگی بجا لا کر اس کا حق مارتا ہے۔ پھر اس بندگیِ غیر کے سلسلے میں آدمی جو عمل بھی کرتا ہے اس میں وہ اپنے ذہن و جسم سے لے کر زمین و آسمان تک کی بہت سی چیزوں کو استعمال کرتا ہے، حالانکہ یہ ساری چیزیں اللہ وحدہٗ لاشریک کی پیدا کردہ ہیں اور ان میں سے کسی چیز کو بھی اللہ کے سوا کسی دوسرے کی بندگی میں استعمال کرنے کا اُسے حق نہیں ہے۔ پھر آدمی پر خود اس کے اپنے نفس کا یہ حق ہے کہ وہ اسے ذلت اور عذاب میں مبتلا نہ کرے۔ مگر وہ خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی بندگی کر کے اپنے آپ کو ذلیل بھی کرتا ہے اور مستحقِ عذاب بھی بناتا ہے۔ اس طرح مشرک کی پوری زندگی ایک ہر جہتی اور ہمہ وقتی ظلم بن جاتی ہے جس کا کوئی سانس بھی ظلم سے خالی نہیں رہتا۔

۲۲ یہاں سے پیراگراف کے آخر تک کی پوری عبارت ایک جملۂ معترضہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے لقمان کے قول کی تشریحِ مزید کے لیے ارشاد فرمایا ہے۔

۲۳ ان الفاظ سے امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بچے

کی کہ میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا[۲۴] تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے[۲۵] اس وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ

کی مدتِ رضاعت دو سال ہے۔ اس مدت کے اندر اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہو تب تو حرمتِ رضاعت ثابت ہو گی، ورنہ بعد کی کسی رضاعت کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے گا۔ امام مالکؒ سے بھی ایک روایت اسی قول کے حق میں ہے لیکن امام ابوحنیفہ نے مزید احتیاط کی خاطر ڈھائی سال کی مدت تجویز کی ہے اور اس کے ساتھ ہی امام صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر دو سال یا اس سے کم مدت میں بچے کا دودھ چھڑا دیا گیا ہو اور اپنی غذا کے لیے بچہ دودھ کا محتاج نہ رہا ہو تو اس کے بعد کسی عورت کا دودھ پی لینے سے کوئی حرمت ثابت نہ ہو گی۔ البتہ اگر بچے کی اصل غذا دودھ ہی ہو تو دوسری غذا تھوڑی بہت کھانے کے باوجود اس زمانے کی رضاعت سے حرمت ثابت ہو جائے گی۔ اس لیے کہ آیت کا منشا یہ نہیں ہے کہ بچے کو لازماً دو سال ہی دودھ پلایا جائے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ "مائیں بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں اس شخص کے لیے جو رضاعت پوری کرانا چاہتا ہو" (رکوع ۳۰)۔

ابن عباس نے ان الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور اہل علم نے اس پر ان سے اتفاق کیا ہے کہ حمل کی قلیل ترین مدت چھ ماہ ہے اس لیے کہ قرآن میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا "اس کا پیٹ میں رہنا اور اس کا دودھ چھوٹنا ۳۰ مہینوں میں ہوا" (الاحقاف رکوع ۲)۔ یہ ایک اہم قانونی نکتہ ہے جو جائز اور ناجائز ولادت کی بہت سی بحثوں کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

۲۴؎ یعنی جو تیرے علم میں میرا شریک نہیں ہے۔

۲۵؎ یعنی اولاد اور والدین، سب کو۔

تم کیسے عمل کرتے رہے ہو۔[۲۶]

(اور لقمان[۲۷] نے کہا تھا کہ، بیٹا، کوئی چیز رائی کے دانہ برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں ہو یا آسمانوں میں یا کہیں زمین میں چھپی ہوئی ہو، اللہ اسے نکال لائے گا۔[۲۸] وہ باریک بیں اور باخبر ہے۔ بیٹا، نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر، اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔[۲۹] یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔[۳۰] اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر[۳۱]، نہ زمین میں اکڑ کر

۲۶۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، سورۂ عنکبوت، حواشی نمبر ۱۱-۱۲۔

۲۷۔ لقمان کے دوسرے نصائح کا ذکر یہاں یہ بتانے کے لیے کیا جا رہا ہے کہ عقائد کی طرح اخلاق کے متعلق بھی جو تعلیمات نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں وہ بھی عرب میں کوئی انوکھی باتیں نہیں ہیں۔

۲۸۔ یعنی اللہ کے علم سے اور اس کی گرفت سے کوئی چیز بچ نہیں سکتی۔ چٹان کے اندر ایک دانہ تمہارے لیے مخفی ہو سکتا ہے، مگر اس کے لیے عیاں ہے۔ آسمانوں میں کوئی ذرہ تم سے بعید ترین ہو سکتا ہے، مگر اللہ کے لیے وہ بہت قریب ہے۔ زمین کی تہوں میں کوئی چیز تمہارے لیے سخت تاریکی میں ہے مگر اس کے لیے بالکل روشنی میں ہے۔ لہٰذا تم کہیں کسی حال میں بھی نیکی یا بدی کا کوئی کام ایسا نہیں کر سکتے جو اللہ سے مخفی رہ جائے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس سے واقف ہے، بلکہ جب محاسبہ کا وقت آئے گا تو وہ تمہاری ایک ایک حرکت کا ریکارڈ سامنے لا کر رکھ دیگا۔

۲۹۔ اس میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ جو شخص بھی نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے کا کام کریگا اس پر مصائب کا نزول ناگزیر ہے۔ دنیا لازماً ایسے شخص کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی ہے اور اسے ہر قسم کی اذیتوں سے سابقہ پیش آ کر رہتا ہے۔

۳۰۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔ اصلاحِ خلق کے لیے اٹھنا اور اس کی مشکلات کو انگیز کرنا کم ہمت لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ان کاموں میں سے ہے جن کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔

۳۱۔ اصل الفاظ ہیں لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ۔ صَعَر عربی زبان میں ایک بیماری کو کہتے ہیں جو

چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔[۳۲] اپنی چال میں اعتدال اختیار کر،[۳۳] اور

اونٹ کی گردن میں ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے اونٹ اپنا منہ ہر وقت ایک ہی طرف پھیرے رکھتا ہے۔ اس سے محاورہ نکلا فلان صعر خدہ، "فلاں شخص نے اونٹ کی طرح اپنا کلّہ پھیر لیا" یعنی تکبر کے ساتھ پیش آیا اور منہ پھیر کر بات کی۔ اسی کے متعلق قبیلۂ تغلب کا ایک شاعر عمرو بن حُیَیّ کہتا ہے:

وکنا اذا الجبار صعر خدہ — اقمنا لہ من میلہ فتقوما

"ہم ایسے تھے کہ جب کبھی کسی جبّار نے ہم سے منہ پھیر کر بات کی تو ہم نے اس کی ٹیڑھ ایسی نکالی کہ وہ سیدھا ہو گیا"۔

۳۲ اصل الفاظ ہیں مختال فخور۔ مختال کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنی دانست میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہو۔ اور فخور اس کو کہتے ہیں جو اپنی بڑائی کا دوسروں پر اظہار کرے۔ آدمی کی چال میں اکڑ اور اتراہٹ اور تبختر کی شان لازماً اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کے دماغ میں تکبر کی ہوا بھر جاتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ دوسروں کو اپنی بڑائی محسوس کرائے۔

۳۳ بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ "نہ تیز بھی نہ چل اور آہستہ بھی نہ چل، بلکہ میانہ روی اختیار کر" لیکن سیاق کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رفتار کی تیزی و سستی زیر بحث نہیں ہے۔ آہستہ چلنا یا تیز چلنا اپنے اندر کوئی اخلاقی حسن و قبح نہیں رکھتا۔ اور نہ اس کے لیے کوئی ضابطہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ آدمی کو جلدی کا کوئی کام ہو تو تیز کیوں نہ چلے۔ اور اگر وہ محض تفریحاً چل رہا ہو تو آخر آہستہ چلنے میں کیا قباحت ہے۔ میانہ روی کا اگر کوئی معیار ہو بھی تو ہر حالت میں ہر شخص کے لیے اسے ایک قاعدۂ کلیہ کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ دراصل جو چیز یہاں مقصود ہے وہ تو نفس کی اُس کیفیت کی اصلاح ہے جس کے اثر سے چال میں تبختر یا مسکینی کا ظہور ہوتا ہے۔ بڑائی کا گھمنڈ اندر موجود ہو تو وہ لازماً ایک خاص طرز کی چال میں ڈھل کر ظاہر ہوتا ہے جسے دیکھ کر نہ صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی کسی گھمنڈ میں مبتلا ہے بلکہ چال کی شان یہ تک بتا دیتی ہے کہ کس گھمنڈ میں مبتلا ہے۔ دولت، اقتدار، حسن، علم، طاقت اور ایسی ہی دوسری جتنی چیزیں بھی انسان کے اندر تکبر پیدا کرتی ہیں ان میں سے ہر ایک کا گھمنڈ اس کی چال کا

۱۹ع اپنی آواز ذرا پست رکھ، سب آوازوں سے زیادہ بُری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔ ۳۳ ع

ایک مخصوص ٹائپ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس چال میں مسکینی کا ظہور بھی کسی نہ کسی مذموم نفسی کیفیت کے اثر سے ہوتا ہے۔ کبھی انسان کے نفس کا مخفی تکبر ایک نمائشی تواضع اور دکھاوے کی درویشی و خدا رسیدگی کا روپ دھارتا ہے اور یہ چیز اس کی چال میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اور کبھی انسان واقعی دنیا اور اس کے حالات سے شکست کھا کر اور اپنی نگاہ میں آپ حقیر ہو کر مریل چال چلنے لگتا ہے۔ لقمان کی نصیحت کا منشا یہ ہے کہ اپنے نفس کی ان کیفیات کو دور کرو اور ایک سیدھے سادھے معقول اور شریف آدمی کی سی چال چلو جس میں نہ کوئی اینٹھ اور اکڑ ہو، نہ مریل پن اور نہ ریاکارانہ زہد و انکسار۔

صحابہ کرام کا ذوق اس معاملہ میں جیسا کچھ تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ ایک شخص کو سر جھکائے ہوئے چلتے دیکھا تو پکار فرمایا "سر اٹھا کر چل، اسلام مریض نہیں ہے"۔ ایک اور شخص کو انہوں نے مریل چال چلتے دیکھا تو فرمایا "ظالم، ہمارے دین کو کیوں مارے ڈالتا ہے"۔ ان دونوں واقعات سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک دینداری کا منشا ہرگز یہ نہیں تھا کہ آدمی بیماروں کی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھے اور خواہ مخواہ مسکین بنا چلا جائے۔ کسی مسلمان کو ایسی چال چلتے دیکھ کر انہیں خطرہ ہوتا تھا کہ یہ چال دوسروں کے سامنے اسلام کی غلط نمائندگی کرے گی اور خود مسلمانوں کے اندر افسردگی پیدا کر دے گی۔ ایسا ہی واقعہ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کو پیش آیا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک صاحب بہت مضمحل سے بنے ہوئے چل رہے ہیں۔ پوچھا انہیں کیا ہو گیا؟ عرض کیا گیا کہ یہ قرّاء میں سے ہیں (یعنی قرآن پڑھنے پڑھانے والے اور تعلیم و عبادت میں مشغول رہنے والے)۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا "عمر سید القرّاء تھے، مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب چلتے تو زور سے چلتے، جب بولتے تو قوت کے ساتھ بولتے اور جب پیٹتے تو خوب پیٹتے تھے"۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۴۳۔ تفسیر سورۂ الفرقان، حاشیہ ۷۹)

۳۳ے اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ آدمی ہمیشہ آہستہ بولے اور کبھی زور سے بات نہ کرے۔ بلکہ گدھے کی آواز سے تشبیہ دے کر واضح کر دیا گیا ہے کہ مقصود کس طرح کے لہجے اور کس طرح کی آواز میں بات کرنے

کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں ۳۵ اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں ۳۶؟ اس پر حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں ۳۷ بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو، یا ہدایت، یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب ۳۸۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو

سے روکنا ہے لہجہ اور آواز کی ایک پستی و بلندی اور سختی و نرمی تو وہ ہوتی ہے جو فطری اور حقیقی ضروریات کے لحاظ سے ہو۔ مثلاً قریب کے آدمی یا کم آدمیوں سے آپ مخاطب ہوں تو آہستہ بولیں گے۔ دُور کے آدمی سے بولنا ہو یا بہت سے لوگوں سے خطاب ہو تو لامحالہ زور ہی سے بولنا ہوگا۔ ایسا ہی فرق لہجوں میں بھی موقع و محل کے لحاظ سے لازماً ہوتا ہے۔ تعریف کا لہجہ مذمت کے لہجے سے اور اظہارِ خوشنودی کا لہجہ اظہارِ ناراضی کے لہجے سے مختلف ہونا ہی چاہیے۔

یہ چیز کسی درجہ میں بھی قابلِ اعتراض نہیں ہے، نہ لقمان کی نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس فرق کو مٹا کر بس ہمیشہ ایک ہی طرح نرم آواز اور پست لہجے میں بات کیا کرے۔ قابلِ اعتراض جو چیز ہے وہ تکبر کا اظہار کرنے اور دھونس جمانے اور دوسرے کو ذلیل و مرعوب کرنے کے لیے گلا پھاڑنا اور گدھے کی سی آواز میں بولنا ہے۔

۳۵ے کسی چیز کو کسی کے لیے مسخر کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چیز اس کے تابع کر دی جائے اور اسے اختیار دے دیا جائے کہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے اور جس طرح چاہے اسے استعمال کرے۔ دوسری یہ کہ اس چیز کو ایسے ضابطہ کا پابند کر دیا جائے جس کی بدولت وہ اس شخص کے لیے نافع ہو جائے اور اس کے مفاد کی خدمت کرتی رہے۔ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ایک ہی معنی میں مسخر نہیں کر دیا ہے، بلکہ بعض چیزیں پہلے معنی میں مسخر کی ہیں اور بعض چیزیں دوسرے معنی میں۔ مثلاً ہوا، پانی، مٹی، آگ، نباتات، معدنیات، مویشی وغیرہ بے شمار چیزیں پہلے معنی میں ہمارے لیے مسخر ہیں، اور چاند، سورج، وغیرہ دوسرے معنی میں۔

۳۶ے کھلی نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو آدمی کو کسی نہ کسی طرح محسوس ہوتی ہیں، یا جو اس کے

اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ اُنہی کی پیروی کریں گے خواہ شیطان اُن کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو؟ ۳۹

علم میں ہیں۔ اور چھپی ہوئی نعمتوں سے وہ نعمتیں مراد ہیں جنہیں آدمی نہ جانتا ہے نہ محسوس کرتا ہے۔ یہ بے حد و حساب چیزیں ہیں جو انسان کے اپنے جسم میں اور اس کے باہر دنیا میں اس کے مفاد کے لیے کام کر رہی ہیں، مگر انسان کو ان کا پتہ تک نہیں ہے کہ اس کے خالق نے اس کی حفاظت کے لیے، اس کی رزق رسانی کے لیے، اس کے نشو و نما کے لیے، اور اس کی فلاح کے لیے کیا کیا سرو سامان فراہم کر رکھا ہے۔ سائنس کے مختلف شعبوں میں انسان تحقیق کے جتنے قدم آگے بڑھاتا جا رہا ہے، اس کے سامنے خدا کی بہت سی وہ نعمتیں بے نقاب ہوتی جا رہی ہیں جو پہلے اس سے بالکل مخفی تھیں، اور آج تک جن نعمتوں پر سے پردہ اٹھا ہے وہ اُن نعمتوں کے مقابلے میں درحقیقت کسی شمار میں بھی نہیں ہیں جن پر سے اب تک پردہ نہیں اٹھا ہے۔

۳۷ یعنی اس طرح کے مسائل میں جھگڑے اور بحثیں کرتے ہیں کہ مثلاً اللہ ہے بھی یا نہیں؟ اکیلا وہی ایک خدا ہے یا دوسرے خدا بھی ہیں؟ اس کی صفات کیا ہیں اور کیسی ہیں؟ اپنی مخلوقات سے اس کے تعلق کی کیا نوعیت ہے؟ وغیرہ۔

۳۸ یعنی نہ تو ان کے پاس کوئی ایسا ذریعۂ علم ہے جس سے انہوں نے براہِ راست خود حقیقت کا مشاہدہ یا تجربہ کر لیا ہو، نہ کسی ایسے رہنما کی رہنمائی انہیں حاصل ہے جس نے حقیقت کا مشاہدہ کر کے انہیں بتایا ہو، اور نہ کوئی کتاب الٰہی ان کے پاس ہے جس پر یہ اپنے عقیدے کی بنیاد رکھتے ہوں۔

۳۹ یعنی ہر شخص اور ہر خاندان اور ہر قوم کے باپ دادا کا حق پر ہونا کچھ ضروری نہیں ہے۔ محض یہ بات کہ یہ طریقہ باپ دادا کے وقتوں سے چلا آ رہا ہے ہرگز اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ حق بھی ہے۔ کوئی عقلمند آدمی یہ نادانی کی حرکت نہیں کر سکتا کہ اگر اس کے باپ دادا گمراہ رہے ہوں تو وہ بھی آنکھیں بند کر کے انہی کی راہ پر چلے جائے اور کبھی یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس کرے کہ یہ راہ جا کدھر رہی ہے

جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے[۱۰۵] اور عملاً وہ نیک ہو[۱۰۶]، اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا[۱۰۷]، اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔ اب جو کفر کرتا ہے اس کا کفر تمہیں غم میں مبتلا نہ کرے[۱۰۸]، انہیں پلٹ کر آنا تو ہماری ہی طرف ہے، پھر ہم انہیں بتا دیں گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ یقیناً اللہ سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ ہم تھوڑی مدت انہیں دنیا میں مزے کرنے کا موقع دے رہے ہیں، پھر ان کو بے بس کر کے ایک سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے۔

۱۰۵؎ یعنی پوری طرح اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں دے دے۔ اپنی کوئی چیز اس کی بندگی سے مستثنیٰ کر کے نہ رکھے۔ اپنے سارے معاملات اس کے سپرد کر دے۔

۱۰۶؎ یعنی یہ بات نہ ہو کہ وہ زبان سے تو اس حوالگی و سپردگی کا اعلان کر دے، مگر عملاً وہ رویہ اختیار نہ کرے جو خدا کے ایک مطیع فرمان بندے کا ہونا چاہیے۔

۱۰۷؎ یعنی نہ اس کو اس بات کا کوئی خطرہ کہ اسے غلط رہنمائی ملے گی، نہ اس بات کا کوئی اندیشہ کہ خدا کی بندگی کر کے اس کا انجام خراب ہو گا۔

۱۰۸؎ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے نبی، جو شخص تمہاری بات ماننے سے انکار کرتا ہے وہ اپنے نزدیک تو یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اسلام کو رد کر کے اور کفر پر اصرار کر کے تمہیں زک پہنچائی ہے، لیکن دراصل اس نے زک اپنے آپ کو پہنچائی ہے۔ اس نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا، اپنا کچھ بگاڑ رہا ہے۔ اگر وہ نہیں مانتا تو تمہیں پروا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

پاکستان میں عیسائیت کی رفتارِ ترقی

از جناب سید محمد جمیل صاحب

(۲)

سرکاری مردم شماری کی رپورٹوں سے فراہم کیے ہوئے اعداد و شمار جو اس سے قبل دیئے جا چکے ہیں، اُن سے یہ امر پوری طرح واضح اور ثابت ہو جاتا ہے کہ ہماری ڈیڑھ سو سالہ سیاسی غلامی کے پورے دَور میں عیسائی مبلغین کی انتہائی کوششوں کے باوجود اسلام سے نکل کر عیسائیت قبول کرنے والوں کی تعداد بمنزلہ صفر رہی حتیٰ کہ جن خطوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں کے غیر مسلم باشندوں کو بھی عیسائی بنانا کوئی آسان کام نہ تھا اور اس کے برعکس سنہ ۱۷۵۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۱ء تک انگریزی اقتدار کے پورے دَور میں متحدہ ہندوستان کے غیر مسلم بکثرت دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے اگرچہ اسلام قبول کرنے والوں کی رفتار میں نسبتاً کمی واقع ہو گئی تاہم مجموعی تعداد و حیثیت کے اعتبار سے بھی اور دوسرے مذاہب کی تبلیغ کے مقابلہ میں نسبتہً بھی ان کا فی صد اوسط ہر دس سال میں زیادہ ہی نکلتا رہا۔

آگے چل کر جو اعداد و شمار دیئے جا رہے ہیں۔ ان سے مندرجۂ ذیل امور کی وضاحت مقصود ہے:

(ا) سنہ ۱۸۸۱ء تا سنہ ۱۹۴۱ء ہندوستان کی مجموعی آبادی میں مختلف مذاہب کا فی صد تناسب

(ب) ہندوستان کی پوری آبادی میں عیسائیوں کا تناسب، نیز اُن علاقوں اور صوبوں میں عیسائیت کا تناسب جو پاکستان میں شامل کیے گئے۔

(ج) سابق پنجاب میں عیسائیت کی رفتارِ ترقی جو پورے شمالی ہندوستان میں اول نمبر پر تھی۔

(د) تقسیم سے لے کر اب تک پاکستان میں عیسائیت کی ترقی کی رفتار

غیر منقسم پنجاب کی مردم شماری ظاہر کرتی ہے کہ سنہ ۱۸۸۱ء تک پورے پنجاب میں صرف تین

ہزار تین سو اکیاون عیسائی تھے۔ اس کے بعد نسبتاً اضافے کی تعداد خاصی تیز رہی ہے۔ اگرچہ مجموعی گنتی اور تناسب کے لحاظ سے عیسائی کچھ زیادہ مقدار میں نہ تھے اور اب تک بھی یہی صورتِ حال ہے لیکن ان میں سیاسی فتنہ انگیزی کی استعداد اپنی مقدار کے بالمقابل زیادہ ہے اور اس وقت بھی اگرچہ وہ ملکی آبادی میں ایک فی صد سے زائد نہیں ہیں لیکن ملک کے معاملات میں ایک "طاقتور مقام" کے حصول کا مطالبہ انہوں نے ابھی سے شروع کر دیا ہے جس کی کچھ تفصیل نیچے بیان کی جا رہی ہے۔

ملکہ وکٹوریا کی طرف سے "مذہبی غیر جانبداری" کے رسمی اعلان کے باوجود انگریزی حکومت عیسائیت کی پشت پناہی کرتی رہی۔ اس حمایت اور ہر طرح کے جائز و ناجائز حربوں کے استعمال کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیوں کی تعداد ۳۳۵۱ سے بڑھتے بڑھتے ۱۸۹۱ء میں اٹھارہ ہزار چھ سو چھبیس تک پہنچ گئی۔ ۱۹۰۱ء میں یہ تعداد چھتیس ہزار آٹھ سو چھپن تھی اور ۱۹۲۱ء میں یہ تین لاکھ آٹھ ہزار چار سو اٹھانوے یعنی ۱۹۰۱ء کے مقابلے میں تقریباً دس گنی تعداد تک جا پہنچی۔ اس کے بعد اس کی رفتار میں کچھ کمی آگئی ۱۹۳۱ء میں یہ تعداد تین لاکھ پچانوے ہزار چھ سو بیس تھی۔ ۱۹۴۱ء میں متحدہ پنجاب میں ہندوستانی عیسائیوں کی تعداد چار لاکھ چھیاسی ہزار تینتیس تھی۔

اس سلسلے میں یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر اور قابلِ توجہ ہے کہ عیسائیوں کی تعداد میں اضافہ تمام تر یا زیادہ تر انہی ڈویژنوں اور اضلاع میں ہوا ہے جہاں نہروں کی وجہ سے نئی آباد کاری ہوئی ہے اور جہاں حکام نے مشنری سوسائٹیوں کے مشورے سے زمینیں تقسیم کی ہیں۔ ایک طرف نہروں کے کھلنے اور دوسری طرف ۱۸۵۸ء کے اعلان "غیر جانبداری" کے علی الرغم زمین کے الاٹ کیے جانے میں مشنریوں کے عمل دخل کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیوں کی آبادی میں ایک ہزار فی صد کا زبردست اضافہ ہو گیا اور بیس سال کے اندر اندر ان کی تعداد چھتیس ہزار آٹھ سو چھپن سے بڑھ کر تین لاکھ چھ ہزار چار سو اٹھانوے تک پہنچ گئی۔ لیکن اس کے متصلاً بعد کے بیست سالہ دور میں مشنریوں کے پورا زور لگانے کے باوجود پھر عیسائیت کے اضافے کی رفتار سابقہ چالیس سالوں کے بالمقابل گھٹ کر ½ رہ گئی۔ اس کے بعد ناجائز اور غیر قانونی ہتھکنڈوں کا پھر دور دورہ شروع ہو گیا اور برطانوی حکومت کے ذمہ داروں نے کھلم کھلا بیان

کیا کہ " ہر نیا عیسائی دراصل ایک بندھن ہے جو ہمارے اور ہمارے محکومین کے درمیان موجود میں آتا ہے اور جس سے ہماری امپائر کو تقویت حاصل ہوتی رہتی ہے "

ان پڑھ، خانہ بدوش اور معاشی لحاظ سے پس ماندہ لوگوں کو سرکاری اراضی اور اس قسم کے دوسرے ناجائز لالچ اور رشوتیں دے دے کر عیسائی بنانے کا انجام یہ ہوا کہ ۱۸۸۱ء میں جو عیسائی فقط تین ہزار تین سو اکیاون تھے ان کی گنتی ۱۹۴۱ء میں ایک سو پچاس گنا بڑھ کر چار لاکھ چھیاسی ہزار تینتیس تک جا پہنچی اور پورے صوبہ پنجاب میں عیسائیوں کی تعداد مجموعی آبادی کا دو فی صد ہو گئی لیکن جن اضلاع میں آبپاشی زمین کے امتیازی عطیات اور غلط بخشیوں کے مواقع ناپید تھے ان میں عیسائی گنتی کے لحاظ سے ناقابلِ ذکر تھے اور ان اضلاع میں عیسائیوں کی ساری تعداد ملا کر بھی نہری اضلاع کے عیسائیوں کے دسویں حصے سے زیادہ نہ تھی۔ یہ ثمرات تو اُن ناجائز اور نازیبا حربوں کے ہیں جو قلیل المیعاد منصوبوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ رہے طویل المیعاد منصوبے اور حربے، جن کے ذریعے سے مسلمانوں کے اندر " انحراف عن الاسلام " کے تدریجی عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا، اُن کی تفصیل آگے آتی ہے۔

زر اور زمین کے عوض لوگوں کے ایمان خریدنے کے باوجود ۱۹۴۱ء تک عیسائیوں کی تعداد پانچ لاکھ سے بھی کم تھی، جن میں سے تقریباً گیارہ فی صد رومن کیتھولک تھے اور بقیہ قریب قریب سارے پروٹسٹنٹ تھے۔ ۱۹۳۱ء میں غیر منقسم پنجاب کے عیسائیوں کی آبادی تین لاکھ پچانوے ہزار چھ سو بیس تھی جن میں سے پینتالیس ہزار سات سو پچانوے رومن کیتھولک تھے۔ اسی سال غیر منقسم بنگال کے ایک لاکھ تراسی ہزار اڑسٹھ عیسائیوں میں سے (جن میں اینگلو انڈین اور یورپین بھی شامل ہیں) رومن کیتھولک عیسائیوں کی تعداد ستر ہزار پانسو اٹھتر، یا دوسرے لفظوں میں کل بنگالی عیسائیوں کی ۲/۵ تھی۔ ۱۹۴۱ء میں متحدہ بنگال کے دیسی عیسائیوں کی تعداد صرف ایک لاکھ گیارہ ہزار چار سو چھبیس تھی جن میں سے ۳۰ فی صد یعنی پچاس ہزار سے بھی کم موجودہ مشرقی پاکستان کے اضلاع میں آباد تھے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ۱۹۴۱ء میں مشرقی بنگال کے رومن کیتھولک عیسائیوں کی تعداد پندرہ ہزار

یا حد سے حد بیس ہزار سے زاید نہیں ہو سکتی تھی۔ اور اس وقت بحیثیت مجموعی ان تمام علاقوں میں جو بعد میں پاکستان بنے، رومن کیتھولک اسی ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ تعداد محض اندازاً اس لیے بیان کی جا رہی ہے کہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں مختلف مسیحی فرقوں کی تعداد الگ الگ نہیں دکھائی گئی ہے۔ اس زمانے کے ہر دس سالہ دور میں اگر عیسائیوں کی تعداد کے ارتقاء کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تدریجی اضافہ بہت معمولی سا ہوا ہے جو آبادی کی عام رفتارِ اضافہ سے کچھ زیادہ متجاوز نہیں ہے۔

لیکن ۱۹۵۰ء میں نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ عیسائیوں کے اپنے بیان کے مطابق ان کی پاکستان میں موجودہ تعداد تقریباً تین لاکھ ہے اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ انہیں مسلمانوں کے اندر مسیحیت کو پھیلانے میں جو کامیابی پاکستان میں نصیب ہوئی ہے وہ دنیا میں کہیں نہیں ہوتی۔

۱۹۵۱ء میں ۱۹۴۱ء کی بہ نسبت ان کی گنتی میں بحیثیت مجموعی اور باعتبار اوسط تئیس فی صد کا اضافہ ہوا ہے جس میں سے مشرقی پاکستان کا اضافہ پینتالیس فی صد ہے اور مغربی پاکستان کا پندرہ فی صد۔ یہ زیادتی ۱۹۳۱-۱۹۴۱ء کے دس سالہ دور کے مقابلے میں بہت بڑھ چڑھ کر ہے۔ ۱۹۴۱ء اور ۱۹۵۱ء کے مابین ضلع لاہور میں بڑھوتری پچاس فی صد سے بھی زیادہ ہے۔ اسی دوران میں کراچی کا اضافہ صد فی صد ہے۔ لیکن ۱۹۵۱ء سے لے کر ۱۹۵۶ء تک جو ترقی مسیحیت کو نصیب ہوئی ہے وہ تو بڑی مہتم بالشان ہے۔ صرف رومن کیتھولک فرقے نے اس مدت میں اپنے پرچار سے اپنی آبادی میں جو اضافہ کیا ہے وہ ۱۹۴۱ء کی آبادی کے مقابلہ میں تین سو فی صد ہے۔

نیشنل کیتھولک المنیک کے بین الاقوامی اندراجات کے مطابق ۱۹۵۷ء میں پاکستان کے رومن کیتھولک عیسائیوں کی تعداد دو لاکھ اکہتر ہزار تین سو بائیس تھی، اور ۱۹۵۸ء میں کینیڈا کا رسالہ پراسپکٹر، ان کی تعداد دو لاکھ اٹھاسی ہزار دو سو تریسٹھ بتاتا ہے۔ یہ نمایاں اضافہ بہر حال ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے بعد وقوع پذیر ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم سے دو ماہ قبل ہندو یہاں کے بیشتر اچھوتوں کو اپنے ساتھ لے کر پاکستان سے ہندوستان منتقل ہو گئے۔ اس موقع کو جبکہ پاکستان کے

مسلمان مسئلۂ مہاجرین اور اس طرح کے دیگر پریشان کن مسائل سے دوچار تھے، ہندو پاکستان کے مشنریوں نے نہایت غنیمت شمار کیا اور انہوں نے باہمدگر رابطہ قائم کر کے اپنی سرگرمیاں وسیع پیمانے پر شروع کر دیں۔ اس مرحلے پر امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور دوسرے مغربی ممالک کے مسیحی جرائد نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان اور پاکستان میں عیسائیت کی تبلیغ کا یہ بہترین وقت ہے۔ ہارٹ فورڈ (امریکہ) کے مشہور عیسائی رسالے "مسلم ورلڈ" کے جنوری ۱۹۵۸ء کے نمبر میں پوری صفائی اور تعین کے ساتھ یہ لکھا گیا کہ

> "ایک حقیقت بالکل واضح اور نمایاں ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کا امن و سکون اس طرح غارت ہو چکا ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ آج عیسائیوں کی طرف سے دوستی کے اظہار کو مسلم افراد پہلے کی بہ نسبت زیادہ خوشی سے قبول کر رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ چکے ہیں، وہ افراتفری کا شکار ہیں اور اپنی ضرورت و احتیاج کو پہچاننے لگے ہیں۔ مسیحی اعانت، مواسات اور ہدایت کے لیے اس سے عظیم تر موقعہ پہلے کبھی میسر نہیں آیا تھا۔ لاہور میں مغربی پاکستان کے لیے کرسچین ریلیف کمیٹی قائم ہو چکی ہے۔ حکومت پاکستان امدادی مہم کے دوران چرچ ورلڈ سروس کا ہر ممکن طریقہ سے ہاتھ بٹا رہی ہے۔ ہمارے نمائندے پاکستان سے برابر یہ اطلاعات دیتے رہتے ہیں کہ سرکاری حکام کی طرف سے ان کو دل کھول کر تعاون اور سہولتیں حاصل ہو رہی ہیں۔"

یہ حالات تھے جن میں مشنری سرگرمیاں بے حد وسعت اختیار کر گئیں۔ اس وقت پاکستان کے دونوں بازوؤں میں مسیحیت کی تبلیغ کے چالیس ادارے موجود ہیں جن کی پشت پر امریکہ، برطانیہ، فرانس، اٹلی، سویڈن اور یورپ کے دوسرے ممالک ہیں۔ ان کے ساتھ بے شمار تعلیمی مراکز اور دوسرے تبلیغی ادارے وابستہ ہیں جن کا جال ملک بھر کے طول و عرض میں بچھا ہوا ہے۔ ان کی جانب سے بیسیوں رسائل ایسے شائع ہوتے ہیں جن میں اسلام پر حملے کیے گئے ہیں، اس کی تعلیمات کو ہدفِ اعتراض بنایا گیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو مطعون کیا گیا ہے

اور قرآن مجید کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلائے گئے ہیں۔ ایسے رسائل ہزارہا کی تعداد میں چھاپ کے نہایت وسیع پیمانے پر تقسیم کیے گئے ہیں۔

پاکستان میں عیسائیت کی تبلیغ کا یہ طوفان اٹھتا رہا۔ اور مسلمان عوام اپنی جگہ یہ سمجھتے رہے کہ حکومت، جو ان کی اپنی حکومت ہے، ان معاملات میں ضرور چوکس ہوگی اور ان حالات کا بروقت اور مناسب نوٹس لے گی۔ لیکن اس پوری مدت میں نہ تو حکومت نے کوئی روک تھام کی اور نہ مسلم پبلک نے حکومت پر بے جا اعتماد کرتے ہوئے کوئی قدم اٹھایا۔ اس کے برعکس ملک کی انتظامی مشینری کے بعض غدار عناصر نے اس بارے میں صریح مداہنت کا رویہ اختیار کیا اور فیاضانہ چشم پوشی بلکہ در پردہ حوصلہ افزائی کے زیر سایہ مسیحیت کو پر پرزے نکالنے کے خوب خوب مواقع میسر آگئے جن سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ دو طرفہ اطمینان حاصل کرنے کے بعد مسیحی مشن نے کامل عیاری اور چالبازی سے کام لیا اور مطلب براری کے لیے جائز و ناجائز ذرائع میں کوئی تمیز روا نہ رکھی۔ اس کے مختلف عناصر مجتمع ہو کر ہر طرح کے گٹھ جوڑ پر اتر آئے اور مجرمانہ طریق کار کے ساتھ خاصی کامیابی حاصل کی۔

مختلف مشنری تنظیمات نے گزشتہ دس سال میں تقریباً دو ارب روپیہ ہندوستان و پاکستان میں اپنی تبلیغ و اشاعت پر صرف کیا ہے (ہندوستان میں اس مقصد کی خاطر جو سرمایہ کھپایا گیا ہے وہ ایک ارب پچیس کروڑ ہے، پاکستان سے متعلق صحیح صحیح اعداد و شمار فراہم نہیں ہو سکے، تاہم دونوں ملکوں میں جو روپیہ عیسائیت کی تبلیغ پر لگایا گیا ہے وہ دو ارب سے کم نہیں ہوگا)۔ اتنی عظیم الشان دولت جو پانی کی طرح بہائی گئی ہے اس کی تہ میں کوئی بے غرضانہ جذبۂ محبت کام نہیں کر رہا تھا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ گزشتہ دس سالوں میں اس سے قبل کے دہ سالہ ادوار کے مقابلے میں عیسائیوں کی تعداد میں دس گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ ڈیڑھ سو سال کی تبلیغی جدوجہد کے باوجود ۱۹۴۱ء میں ضلع کراچی کے عیسائیوں کی تعداد مشکل گیارہ ہزار تھی جو ۱۹۵۱ء میں بڑھ کر اکیس ہزار ہو گئی۔ ۱۹۶۰ء کے بارے میں سرکاری اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں لیکن ایک

غیر سرکاری اندازے کے مطابق اب یہ تعداد چالیس ہزار تک جا پہنچی ہے اور مسیحی آبادیوں میں گھوم پھر کر جو اندازہ ذاتی طور پر لگایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی اکثریت اسلام سے نکل کر عیسائیت میں داخل ہوئی ہے۔ ضلع میمن سنگھ میں دو صد سالہ کوششوں کے باوجود عیسائی ۱۹۴۱ء تک فقط دو ہزار تین سو بائیس تھے ۱۹۵۱ء میں ان کی تعداد بڑھ کر بتیس ہزار آٹھ سو چونسٹھ تک جا پہنچی۔ چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں میں عیسائی ۱۹۴۱ء میں صرف ساٹھ تھے اور ۱۹۵۱ء میں وہ تین ہزار سات سو پینتالیس ہو گئے۔ اس طرح ضلع چاٹگام میں عیسائی ۱۹۴۱ء میں تین سو پچانوے تھے لیکن ۱۹۵۱ء میں وہ ایک ہزار نو سو گیارہ ہو گئے۔

بہاولپور اور رحیم یار کی ریاستوں میں پہلے عیسائیت کی تبلیغ قانوناً ممنوع تھی۔ مغربی پاکستان میں مدغم ہو جانے کے بعد دونوں ریاستوں سے یہ پابندی ہٹائی گئی۔ اب وہاں مسیحیت کے پرستاروں کی تعداد پندرہ ہزار ہے اور بڑے بڑے چرچ اور تبلیغی مراکز وجود میں آچکے ہیں جن کا پہلے نام و نشان نہ تھا۔ لائل پور کے ضلع میں ایک نیا "یروشلم" تعمیر کیا گیا ہے بعض نہایت زرخیز افتادہ زمینوں میں اشاعتی ادارے کھولے گئے ہیں اور روپے کے عوض لوگوں کے ضمیر گرو رکھے جا رہے ہیں اور ان کی دینی وفاداریوں کے محور تبدیل کیے جا رہے ہیں۔ بلاشبہ کینیڈا کے مسیحی جریدے کا یہ ادعا بالکل بجا ہے کہ مسلمانوں کو عیسائیت کا حلقہ بگوش بنانے میں چرچ کو سب سے بڑھ کر کامیابی پاکستان میں نصیب ہو رہی ہے۔ اس جریدے نے ۵۸-۱۹۵۷ء میں مشرقی ممالک کے اندر عیسائیت کے ارتقاء پر مندرجۂ ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:۔

"گزشتہ سال مشرق بعید کے ممالک میں (بشمول پاکستان) مشنری سرگرمیوں کی ترقی اپنے بامِ عروج تک پہنچ چکی ہے۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق اس سال اکیس لاکھ اکیس ہزار سات سو سولہ افراد کو بپتسمہ دیا گیا۔ ان ممالک کی ایک ارب تیس کروڑ ایک لاکھ تریسٹھ ہزار مجموعی آبادی میں رومن کیتھولک عیسائیوں کی تعداد اب تین کروڑ چھبیس لاکھ چوبیس ہزار چھ سو ننانوے ہے۔"

پاکستان میں جو متعدد بین الاقوامی مشنری تنظیمیں کام کر رہی ہیں، اُن میں سے صرف ایک کی رُوداد یہ ہے۔ غیر ملکی مالی سرپرستی اور نگرانی میں جو دوسری تنظیمات اسی طرح یہاں سرگرمِ کار ہیں اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

مہاجرین کی خاطر جو بیرونی امداد ہم کو مطالبے پر یا بلا مطالبہ دی گئی تھی، یقیناً وہ اس بات کے لیے وجہِ جواز فراہم نہیں کرتی تھی کہ "اسلام کے نبی اور اُس کے خیالی مشن" پر حملے کیے جائیں! لیکن افسوس کہ یہ سب کچھ کیا گیا اور اب تک کیا جا رہا ہے۔ اس کی شہادت میں ہمارے پاس بیسیوں کتابیں اور رسالے موجود ہیں۔ ان میں سے بعض ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں چھپے ہیں۔ ان میں اسلام کے خلاف نہایت گھٹیا قسم کی دریدہ دہنی اور دشنام طرازی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے اب تک اپنے جذبات کو قابو میں رکھا ہے۔ وہ اب تک بھی کوئی ایسی عملی کارروائی کرنے پر آمادہ نہیں ہیں، جیسی اس طرح کے حالات میں وہ برطانوی عہد میں کر گزرتے تھے۔ لیکن حکومت کو بھی اس صورتِ حال کی طرف متوجہ نہ کرنا یقیناً قومی خودکشی کے مترادف ہے۔ موجودہ صورتِ حال میں صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور اخلاقی حس اور غیرت و حمیت کی آزمائش انتہائی حد کو پہنچ چکی ہے۔ یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں بآسانی آ سکتی ہے کہ چند سکے، پُرانے کپڑے اور دودھ کے سفوف دے کر انسانی ضمیر و ایمان کے سودے نہیں چکائے جا سکتے۔ یہ ایک ناقابلِ عفو اور مجرمانہ بدمذاقی ہے۔ زیادہ برہنہ مگر حقیقت پسندانہ الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک طرح کی جسمانی نہیں بلکہ روحانی اور معنوی قحبہ گری ہے۔ قومی سیرت و کردار کو اس سے زیادہ مسخ، مجروح اور منہدم کرنے والی کوئی اور شے نہیں ہے کہ ہم وہ قرضے اور عطیے قبول کریں جو اس قسم کی شرائط سے مشروط ہوں یا جنھیں قبول کرنے سے یہ ذلت آپ ہی آپ ہم پر مسلط ہوتی ہو۔ اس کے بُرے نتائج میں سے ایک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو دینی لحاظ سے "غیر جانبدار" بنایا جا رہا ہے، جو نہ عیسائی بنتے ہیں نہ مسلمان رہتے ہیں، وہ کمیونزم کے لیے تر نوالہ ثابت ہوں۔ (باقی)

ارض القرآن کا سفر

جناب محمد عاصم صاحب

(۹)

مدینہ منورہ کے آثار میں اصل اور سب سے بڑا اثر تو خود مسجد نبوی ہے۔ اس کے علاوہ پہاڑ، گھر، مساجد اور کنوئیں بہت سی چیزیں آثار میں شامل ہیں۔ ان میں سے بعض تو مدینہ منورہ کے اندر واقع ہیں کہ ان کے دیکھنے کے لیے کسی سواری کا اہتمام کرنا ضروری نہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو مدینہ منورہ سے باہر چند میل کے فاصلہ پر واقع ہیں اس لیے انہیں دیکھنے کے لیے خاص اہتمام کی ضرورت ہے۔ ہم نے حبیب الرحمٰن صاحب وغیرہ سے مل کر یہ پروگرام طے کیا کہ پہلے ہم باہر کے آثار سے فارغ ہولیں۔ جو آثار خود مدینہ کے اندر ہیں، انہیں مدینہ کے قیام کے دوران ہر وقت دیکھا جا سکتا ہے۔

اُحُد اس پروگرام کے تحت ہم ۱۵ / دسمبر (۵۹ء) کی صبح ۱۰ بجے کے قریب سب سے پہلے اُحد گئے۔ یہ وہ پہاڑ ہے جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے "ھذا جبل یحبنا ونحبہ" (یہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں)۔ اسی پہاڑ کے دامن میں ۳ھ میں مشہور غزوۂ احد پیش آیا تھا جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے اور بہت سے دوسرے صحابہ کرام کے علاوہ حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کی شہادت واقع ہوئی۔ مدینہ سے اس کا فاصلہ شمال کی جانب تین چار میل ہے۔ اور یہ مشرق سے مغرب کو ۴ میل کے قریب لمبا ہے۔ جب تک انسان اس کے قریب نہیں پہنچتا، دُور سے دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ متعدد پہاڑی سلسلوں کا مجموعہ ہے اس تک پہنچنے سے پہلے دائیں طرف ایک چھوٹی سی پہاڑی آتی ہے، جس کا قدیم نام جبل عینین ہے۔ لیکن اب یہ جبل الرماۃ (تیر اندازوں کا پہاڑ) کے نام سے مشہور ہے۔ اسی پہاڑی پر غزوہ اُحد کے

موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس تیراندازوں کو متعین فرمایا تھا اور انہیں حکم دیا تھا کہ وہ ہرگز اپنی جگہ سے نہ ہٹیں، خواہ جنگ میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہو یا شکست۔ جبل الرماۃ اور جبل اُحد کے درمیان وہ وادی (جسے وادی قناۃ کہا جاتا ہے) ہے جس میں غزوہ احد واقع ہوا۔ مسلمانوں کا لشکر ان دونوں پہاڑوں کے درمیان مشرق کی طرف تھا اور کفارِ مکہ کا لشکر جبل اُحد کے گرد چکر کاٹ کر مغرب کی طرف سے آیا تھا۔ اس وادی میں جبل الرماۃ سے کچھ مغرب کو ایک چار دیواری کے اندر وہ صحابۂ کرام مدفون ہیں جو غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے۔ حضرت حمزہؓ اب ان ہی صحابہ کرام کے ساتھ مدفون ہیں۔ پہلے ان کی قبر الگ واقع تھی اور اس پر قبہ بھی بنا ہوا تھا۔ لیکن یہ قبر وادی کے عین وسط میں تھی اور آئے دن کے سیلاب سے اس کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا اس لیے ترک امراء نے حضرت حمزہؓ کی لاش کو یہاں سے نکال کر دوسری جگہ دفن کر دیا۔ اب بھی حضرت حمزہؓ کی پہلی قبر پر قبہ موجود ہے۔ مگر اس کا نصف حصہ منہدم ہو چکا ہے۔ ترکی عہد میں حضرت حمزہؓ اور غزوۂ اُحد کے دوسرے شہداء کی قبروں پر خوب نذرانے چڑھائے جاتے تھے اور اہل مدینہ سال میں تین دن یہاں میلہ لگایا کرتے تھے۔ مگر سعودی حکومت نے ان تمام بدعات کو ختم کر دیا ہے۔ اب ان قبروں پر سعودی حکومت کی طرف سے باقاعدہ پہرہ رہتا ہے تاکہ یہاں غیر شرعی حرکتیں نہ کی جا سکیں۔ جو لوگ احد کی زیارت کے لیے آتے ہیں، انہیں وادیٔ قناۃ سے آگے بھی نہیں بڑھنے دیا جاتا۔ ہمارے پاس کیمرہ تھا اور ہم ان قبروں کا فوٹو بھی لینا چاہتے تھے، مگر پولیس کے جو آدمی وہاں پہرہ پر متعین تھے، ان میں سے ایک نے ہمیں آکر روک دیا کہ ہم نہ قبروں کا فوٹو لیں اور نہ جبل اُحد کی طرف جائیں۔ ہمارے کہنے پر وہ ہمیں اپنے سے اوپر کے ایک ذمہ دار آدمی کے پاس لے گیا۔ جسے ہم نے بتایا کہ ہم لوگ بھی صحیح عقیدہ رکھتے ہیں، اس لیے ہم سے کسی غیر شرعی حرکت کا اندیشہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر اس نے نہ صرف ہمیں قبروں کا فوٹو لینے اور جبل اُحد تک جانے کی اجازت دی بلکہ ہمیں اپنے کمرے میں بٹھا کر چائے اور نجدی قہوہ سے ہماری مہمانی بھی کی۔

وادی سے آگے بڑھ کر جبلِ اُحد کی طرف جاتے ہوئے ایک جگہ چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے

کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک شہید ہوئے تھے۔ جبلِ اُحد کے اندر تقریباً سو گز کی اونچائی پر ایک چھوٹا سا غار ہے، جس میں دو تین آدمی بیٹھ سکتے ہیں اس غار کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دندانِ مبارک کی شہادت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ آرام فرمایا تھا۔ اس غار کے دہانے پر سفیدی کی ہوئی ہے، اس لیے یہ کافی فاصلے سے نظر آنے لگتا ہے۔ آثار مدینہ کے متعلق بعض کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ اس غار کے اندر کوفی رسم الخط میں بعض عبارتیں لکھی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ مگر ہمیں تو تلاش کے باوجود اس میں کوئی عبارت نظر نہیں آئی۔ ممکن ہے پہلے یہ عبارتیں پائی جاتی ہوں اور اب مٹ چکی ہوں۔ اس غار کے قریب ہی پہاڑ کے ایک دامن میں ایک چھوٹی سی اور مسجد بنی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں معرکہ کے بعد غار سے اتر کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر و عصر کی نماز پڑھی تھی۔

قُبا ظہر کی نماز ہم نے مدینہ منورہ واپس آکر مسجد نبوی میں پڑھی۔ پھر کھانا کھایا اور اس کے بعد مسجد قبا دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ جو مدینہ منورہ سے جنوب مغرب کی طرف چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ وہ مسجد ہے جس کی بنیاد خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (جب کہ آپ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تھے اور قبا کی بستی میں آپ نے چار روز قیام فرمایا تھا) اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھی تھی اور اس کی تعمیر میں آپ بنفسِ نفیس شریک ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے یہ سب سے پہلی مسجد ہے جو مدینہ منورہ پہنچ کر حضورؐ نے تعمیر فرمائی۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ — یہ وہ مسجد ہے جس کی بنیاد روزِ اول سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔

حضورؐ کو قبا اور اس کے رہنے والوں سے اس قدر محبت تھی کہ آپ ہر بدھ کے روز یہاں پیدل تشریف لاتے اور ان کی اس مسجد میں نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔

آج سے چند سال پیشتر مدینہ سے قبا جانے والی سڑک کچی اور نہایت تکلیف دہ تھی، لیکن اب اس سڑک کو بالکل سیدھا صاف کر دیا گیا ہے اور اسے پختہ اور نہایت شاندار بنا دیا گیا ہے۔ یہاں

تک کہ مدینہ منورہ سے نکلتے ہی یہ مسجد نظر آنے لگتی ہے۔ ہم نے عصر کی نماز یہیں پہنچ کر ادا کی۔

مسجد الجمعہ | مسجد قبا کو جاتے ہوئے سڑک کی بائیں طرف ایک اور مسجد آتی ہے جسے مسجد الجمعہ کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل قبیلہ بنو سالم کی مسجد تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے موقع پر جمعہ کے روز قبا سے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ راستے میں جب آپ بنو سالم کی بستی میں پہنچے تو جمعہ کا وقت ہو گیا، چنانچہ آپ نے اسی جگہ جمعہ کی نماز ادا فرمائی۔ یہ جمعہ کی پہلی نماز تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں ادا فرمائی اسی نسبت سے اس مسجد کو مسجد الجمعہ کہا جانے لگا۔ اب یہ مسجد نہایت پختہ اور خوبصورت بنی ہوئی ہے، اگرچہ اس کے گرد اب کوئی آبادی نہیں ہے۔

دار کلثوم و دار سعد | مسجد قبا سے متصل جنوب میں (یعنی قبلہ رُخ) دو گھر بنے ہوتے ہیں جن کی چھت گنبد کی شکل کی ہے اور اس پر سفیدی کی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک گھر اس جگہ بنا ہوا ہے جہاں حضرت کلثوم بن ہدمؓ کا گھر تھا اور دوسرا اس جگہ جہاں حضرت سعد بن خیثمہؓ کا گھر تھا۔ مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے جب قبا پہنچے تھے، تو آپ نے حضرت کلثوم بن ہدمؓ کے گھر کو اپنے قیام کے لیے اور حضرت سعد بن خیثمہؓ کے گھر کو اپنی مجلس کے لیے پسند فرمایا تھا اور یہ دونوں گھر مسجد سے متصل جنوب میں (یعنی قبلہ رُخ) واقع تھے۔

بئر اریس یا بئر خاتم | مسجد قبا سے تقریباً پچاس قدم کے فاصلہ پر ایک کنواں ہے، جسے بئر اریس کہا جاتا ہے۔ یہ کنواں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی موجود تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کا پانی کھارا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دہنِ اقدس کا لعاب اس میں ڈالا جس کی برکت سے اس کا کھارا پانی میٹھے پانی میں تبدیل ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس انگوٹھی کو پہنا کرتے تھے، وہ انگوٹھی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کو ملی تھی۔ ایک دن حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے چھوٹ کر وہ اس کنوئیں میں گر گئی اور پھر تلاش کے باوجود نہ مل سکی۔ اس لیے اس کنوئیں کو بئر خاتم بھی کہتے ہیں۔

آج سے چند سال پیشتر تک اس کنوئیں سے پانی نکالا جاتا تھا اور اس سے اردگرد کے باغ اور کھیتوں کو سیراب کیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس کے قریب ایک بہت بڑا ٹیوب ویل لگ جانے کی وجہ سے اس کا پانی خشک ہو گیا ہے۔

مسجدِ ضرار؟ مسجد قبا اور بئر خاتم سے فارغ ہوئے، تو ایک عجیب لطیفہ رہا حبیب الرحمٰن صاحب ہمارے ساتھ نہ تھے، لیکن انہوں نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ مسجد قبا سے مشرق کی طرف تھوڑے ہی فاصلہ پر مسجد ضرار کے کھنڈرات بھی پائے جاتے ہیں۔ مسجد ضرار سے مراد وہ مسجد ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین نے مسجد قبا کی اہمیت کو کم کرنے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے کے لیے ایک اڈہ کے طور پر تعمیر کی تھی، اور پھر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دعوت قبول بھی فرمالی، مگر فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ، وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى، وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ. لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا، لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ، فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۔

(التوبہ: ۱۰۷-۱۰۸)

کچھ لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوتِ حق کو) نقصان پہنچائیں، اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں اور اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں، جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول کے خلاف برسرپیکار ہو چکا ہو۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا، مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد (یعنی مسجد قبا) اوّل روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی، وہی اس کے لیے موزوں ہے

کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں، جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔"

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس مسجد کو گرانے کا حکم دیا اور وہ گرا دی گئی۔

ہمیں خیال بھی نہ تھا کہ اس مسجد کا بھی کوئی نام و نشان اس وقت موجود ہو گا۔ آثارِ مدینہ کے متعلق کسی کتاب میں اس کا ذکر بھی کہیں نہ دیکھا تھا، لیکن حبیب الرحمٰن صاحب کے کہنے پر ہمیں خیال ہوا کہ شاید اس مسجد کا کوئی نام و نشان موجود ہو اور کسی کتاب کے مصنف نے اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس کا ذکر نہ کیا ہو۔ ہم نے اپنے ڈرائیور سے معلوم کیا، تو اس نے بھی بڑے وثوق اور جزم سے کہا کہ ہاں مجھے اس مسجد کی جگہ کا علم ہے اور میں آپ لوگوں کو وہاں لے جاتا ہوں۔ چنانچہ وہ ہمیں سیدھا مدینہ منورہ واپس لانے کے بجائے مسجد قبا سے مشرق کی طرف لے گیا اور ایک گھنٹہ تک کھجوروں کے مختلف باغوں کے درمیان پھراتا رہا اور ہر مرتبہ ہمارے دریافت کرنے پر یہی جواب دیتا رہا کہ چند منٹ میں ہم اس مسجد تک پہنچنے والے ہیں۔ مگر جب ایک گھنٹہ تک بھٹکتے رہنے کے باوجود اسے مسجد ضرار کا پتہ نہ چل سکا، تو ہم نے اس سے کہا کہ وہ ہمیں مدینہ واپس پہنچا دے، چنانچہ وہ آخر کار ہمیں مدینہ منورہ کے قبرستان البقیع کے پاس لے آیا۔ اس طرح اس کے کرایہ کے دس ریال زیادہ ہو گئے، اگرچہ ہم نے جس مقصد کے لیے اسے یہ دس ریال دیئے وہ ہمیں حاصل نہ ہو سکا۔ البتہ ایک فائدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ ہم جس علاقہ میں چکر لگاتے رہے وہ حرۃ واقم کا علاقہ تھا، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ سے پہلے یہودی قبائل بنو قریظہ اور بنی نضیر آباد تھے۔ اس علاقہ کی سرسبزی و شادابی اور اس میں کھجوروں کی کثرت کو دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوا کہ کس طرح یہودیوں نے مدینہ منورہ کے زرخیز و شاداب علاقہ پر قبضہ جما رکھا تھا اور اسی لیے وہ عربوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ان پر مالی اقتدار رکھتے تھے۔

بئر رومہ یا بئر عثمانؓ اگلے دن (۱۶ دسمبر) ہم پھر حبیب الرحمٰن صاحب کے ساتھ مدینہ منورہ کے آثار دیکھنے کے لیے نکلے۔ صبح کے وقت ہم بئر رومہ آئے۔ یہ ایک پرانا کنواں ہے

جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اب تک چلا آرہا ہے یہ اپنے پانی کی مٹھاس اور لذت کی وجہ سے مشہور تھا لیکن اس کا مالک ایک یہودی تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ اس کنوئیں کو خرید کر عام مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا جاتے۔ حضرت عثمانؓ نے اسی وقت یہ کنواں اس کے یہودی مالک سے بیس ہزار درہم میں خریدا اور اسے وقف کر دیا۔ اسی لیے اس کنوئیں کو بئر عثمان بھی کہتے ہیں۔ اب بھی یہ کنواں مسجد نبوی کے اوقاف میں شامل ہے اور حکومت نے اس کے قریب باقاعدہ ڈیری فارم، زراعتی فارم اور پولٹری فارم قائم کر رکھے ہیں۔ اس میں چار انچ موٹا پائپ لگا ہوا ہے جو ہر وقت مشین کے ذریعے سے پانی کھینچتا رہتا ہے۔ مدینہ منورہ سے اس کا فاصلہ شمال مغرب کی جانب تین چار میل ہے۔

مسجد القبلتین اس کے بعد ہم مسجد القبلتین (دو قبلوں والی مسجد) آتے، جو مدینہ سے شمال مغرب ہی میں ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر العقاب نامی ایک بستی میں واقع ہے۔ یہ دراصل قبیلہ بنی سلمہ کی مسجد تھی۔ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مسجد میں بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے ظہر کی نماز ادا فرما رہے تھے کہ تحویلِ قبلہ کی وحی نازل ہوئی اور حضورؐ نے نماز ہی میں بیت المقدس کی طرف سے منہ پھیر کر بیت اللہ کی جانب رُخ کر لیا۔ اسی لیے اس مسجد کو مسجد القبلتین کہا جاتا ہے۔ گذشتہ سفر میں جب ہم نے اس مسجد کی زیارت کی تھی تو یہاں دو محرابیں بنی ہوئی تھیں ایک کا رُخ بیت المَقدِس کی طرف تھا اور دوسری کا بیت اللہ کی طرف، اب کی مرتبہ ہم نے دیکھا کہ مسجد کی ساری عمارت نئی اور نہایت پختہ و شاندار بنادی گئی ہے اور اس میں دو کے بجائے صرف ایک محراب بنائی گئی ہے۔ بیت المقدس کے رُخ والی محراب توڑدی گئی ہے

وادی عقیق اس مسجد کے مغرب میں وادی عقیق ہے، جو مدینہ منورہ کی سب سے مشہور وادی ہے اور جو ایک زمانہ میں خلفاء، امراء اور شعراء کے محلات کی وجہ سے مشہور تھی۔ اب اس میں بعض محلات کے صرف کھنڈر پائے جاتے ہیں۔ مسجد القبلتین کے عین سامنے سعید بن وقاص

حضرت معاویہؓ کے زمانے کا ایک اموی امیر) کا محل تھا، جس کی جگہ پر اب شاہ سعود کا محل بنا ہوا ہے۔

خندق اور جبل سلع اس کے بعد ہم جبل سلع آئے، جو مدینہ منورہ سے متصل شمال مغرب ہی کی سمت میں واقع ہے اور کافی بلند اور بڑا پہاڑ ہے۔ مدینہ سے احد جانے والے کو یہ بائیں طرف نظر آتا ہے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے مدینہ منورہ کی حفاظت کے لیے جو خندق کھودی تھی، وہ اگرچہ کئی صدیوں سے مٹ چکی ہے، لیکن جن مؤرخین نے تحقیق کی ہے ان کا اندازہ ہے کہ وہ نصف دائرہ کی شکل میں اس طرح کھودی گئی تھی کہ حرۃ واقم کے قریب سے شروع ہوتی تھی اور پھر جبل سلع کے شمالی اور مغربی دامن کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی مغرب کو چلی گئی تھی۔ جبل سلع ہی کے دامن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا لشکر ٹھہرا ہوا تھا۔ کفار کے لشکر شمال مغرب کی طرف سے مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے آئے تھے۔

مسجد ذُباب یا ذُویاب سلع کے شمال میں اس سے بالکل متصل سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے۔ اس پہاڑ پر ایک مسجد بنی ہوئی ہے، جس کا نام مسجد ذُباب یا ذوباب ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ مسجد اس جگہ بنی ہوئی ہے، جہاں غزوۂ احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی اور اپنا خیمہ لگایا تھا۔

مسجد فتح سلع کے دامن میں شمال مغرب کی طرف ایک اور مسجد ہے، جس کا نام مسجد الفتح ہے۔ روایات میں ہے کہ اس جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا فرمائی تھی کہ وہ کفار کے لشکروں کو تتر بتر کر دے اور مدینہ اور اہلِ مدینہ کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ تیسری مرتبہ جب حضورؐ نے دعا فرمائی، تو آپ کی دُعا قبول ہوئی، یہاں تک کہ آپ کے چہرے پر خوشی کے آثار نظر آنے لگے، اسی لیے اس مسجد کو مسجد الفتح کہا جاتا ہے۔

مساجدِ خمسہ مسجد الفتح کے جنوب میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سلسلہ وار پانچ چھوٹی چھوٹی مسجدیں بنی ہوئی ہیں جو حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ کے نام سے منسوب ہیں، مگر کوئی مستند روایت ایسی نہیں ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر یہ صحابۂ کرام انہی مقامات پر

متعین رہے ہوں۔

کہف بنی حرام سلع کے جنوب مغرب میں ایک غار ہے، جسے کہف بنی حرام کہا جاتا ہے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت یہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔

مسجد شمس سلع سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ مسجد شمس اور حصن کعب بن اشرف کی طرف گئے۔ مسجد شمس اس جگہ واقع ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کے محاصرہ کے دوران چھ دن نماز ادا فرمائی تھی۔ یہ مسجد مسجد قبا کے مشرق میں چند فرلانگ کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جس میں بنو نضیر آباد تھے۔ ممکن ہے پہلے کبھی اس مسجد کی کوئی باقاعدہ عمارت رہی ہو، لیکن اب تو اس جگہ ایک چھوٹی سی چاردیواری ہے اور بس۔

حصن کعب بن اشرف مسجد شمس سے قریب جنوب کی طرف کعب بن اشرف کا قلعہ ہے جو اب منہدم ہے اور اس کی صرف چاردیواری موجود ہے، لیکن اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قلعہ کس قدر مضبوط ہوگا۔ یہ قلعہ ۴۲ گز کے قریب لمبا اور ۴۲ ہی گز کے قریب چوڑا ہے۔ اس کی دیوار کی چوڑائی ۴ فٹ ہے۔

ملاقاتیں ظہر سے پہلے پہلے ہم اپنے ہوٹل واپس پہنچ گئے اور ظہر کی نماز مسجد نبوی میں ادا کی۔ رات گئے تک مختلف حضرات ملاقات کے لیے آتے رہے۔ مغرب کے بعد شیخ قاسم اندیجانی، شیخ محمد سلطان نمنگانی اور ان کے ساتھ بعض ترکستانی نوجوان آئے۔ محمد سلطان نمنگانی بھی ایک ترکستانی عالم ہیں اور ان کا مسجد نبوی کے قریب باب السلام کے سامنے "المکتبۃ العلمیۃ" کے نام سے ایک مکتبہ ہے۔ یہ حضرات اپنے حالات سناتے رہے اور خاص طور پر عربی قومیت کے تعصب کی سخت شکایت کرتے رہے۔ ایک ترکستانی نوجوان نے بتایا کہ کچھ عرصہ ہوا مصر و شام میں کمیونزم کے خلاف حکومت اور پریس کی طرف سے مہم جاری تھی۔ میں نے بھی کمیونزم کے خلاف ایک مضمون لکھ کر دمشق کے ایک پرچے کو بھیجا۔ مگر وہاں کے سنسر والوں نے وہ مضمون جوں کا توں مجھے واپس بھیج دیا اور اس پر یہ نوٹ دیا کہ "آپ لوگ کمیونزم پر تنقید دینی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم صرف "مصالح القومیۃ العربیۃ"

کے نقطۂ نظر سے اس کی مذمت کر رہے ہیں" گویا دوسرے الفاظ میں ہم قومی اغراض کے لیے کبھی کمیونزم سے لڑیں گے اور کبھی اس سے دوستی کریں گے۔ تم لوگ دین کی بنیاد پر اس کی مخالفت کر کے یہ راستہ ہی بند کر دیتے ہو کہ کبھی اس سے دوستی ہو سکے!

مدینہ منورہ کے اندر کے آثار اگلے دن (۱۷ دسمبر) ہم اپنی قیام گاہ ہی پر رہے۔ میں نے اور چودھری غلام محمد صاحب نے بعض ان آثار کے فوٹو لیے جو مدینہ منورہ کے اندر موجود ہیں:

مسجد المصلی یا مسجد الغمامہ یہ مسجد باب شامی سے باب عنبریہ کو جاتے ہوئے راستے میں آتی ہے یہ اس جگہ بنی ہوئی ہے، جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید کی نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ اس وقت یہاں مسجد نہیں تھی۔ مسجد غالباً دوسری صدی ہجری میں بنی اور اس کے بعد مدینہ میں عید کی نماز یہیں پڑھی جاتی رہی، لیکن اب عید کی نماز مسجد نبوی ہی میں ہوتی ہے اور اس مسجد میں بچوں کی دینی تعلیم کا ایک مکتب قائم ہے۔

بئر بُضاعہ اس سڑک پر جو باب شامی سے مسجد نبوی کو آتی ہے، ایک مکان میں بئر بضاعہ اب تک موجود ہے اور اب بھی اس سے مشین کے ذریعہ پانی نکال کر غالباً برف بنائی جاتی ہے۔ یہ کنواں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اب تک چلا آ رہا ہے اور حدیث و فقہ کی کتابوں میں پانی کی طہارت و نجاست کی بحث میں اکثر اس کا ذکر آتا ہے۔

سقیفہ بنی ساعدہ بئر بضاعہ کے قریب ہی اس سڑک پر ایک جگہ کو سقیفہ بنی ساعدہ بتایا جاتا ہے، یعنی وہ جگہ جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مہاجرین و انصار نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کی تھی۔

دار جعفر صادق و ابی ایوبؓ انصاری اسی روز مغرب کے بعد ہم مسجدِ نبوی کے خطیبؒ امام شیخ عبدالعزیز کی ملاقات کے لیے ان کے ہاں حاضر ہوئے۔ وہ بیمار تھے، ان کی عیادت مقصود تھی۔ شیخ عبدالعزیز کا مکان مسجد نبوی کے قریب ہی واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ کبھی کسی زمانہ میں امام جعفر صادقؒ کا مکان تھا۔ اس کے ساتھ شمال کی طرف جو گھر ہے، اسے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا گھر بتایا جاتا ہے، جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد کم سے کم سات ماہ اور زیادہ سے زیادہ ایک سال تک

مقیم رہے، یہاں تک کہ مسجد کے ساتھ آپ کی رہائش کے لیے کمرے بن گئے۔

مدینہ منورہ میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے گھروں کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے، لیکن اب ان تمام مکانات کی جگہیں حرم کی نئی تعمیر کے بعد سڑک کے نیچے آگئی ہیں۔

مدینہ منورہ میں بھی ترکستانی مہاجرین کی تعداد اچھی خاصی ہے، بلکہ طائف کی نسبت یہاں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ ان کے ایک عالم شیخ محمود علرازی (جو شیخ قاسم اندجانی کے داماد بھی ہیں)، ہر روز صبح کی نماز کے بعد مسجد نبوی میں ایک جگہ قرآن، حدیث اور بعض فقہی کتابوں کا اپنی قومی زبان میں درس دیتے ہیں اور اس میں تمام ترکستانی مہاجرین شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ترکستانی مہاجرین مولانا مودودی کو اپنا ہم قوم سمجھتے ہیں، کیونکہ مولانا کا ننھیالی خاندان اورنگ زیب کے زمانے میں ترکستان ہی سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا تھا، اسی لیے دینی تعلق کے علاوہ وہ مولانا سے اپنا قومی تعلق بھی سمجھتے ہیں۔ شیخ محمود نے ایک دن مولانا کو اپنے درس میں شریک ہونے کی دعوت دی، تاکہ اس طرح تمام ترکستانی مہاجرین بیک وقت ان سے ملاقات کر سکیں۔ مولانا نے ان کی اس دعوت کو قبول کیا اور اگلے دن (۲۸ دسمبر) کی صبح ان کے درس میں شریک ہوئے۔ سو کے قریب حاضری تھی۔ تمام لوگوں نے یکے بعد دیگرے مولانا سے سلام و مصافحہ کیا۔

ترکستانی حضرات کی دعوت اسی روز دوپہر کے بعد شیخ محمود صاحب ہی کے مکان پر ہماری کھانے کی دعوت تھی۔ یہاں مدینہ کی ترکستانی برادری کے تمام بزرگ موجود تھے۔ ترکستانی حضرات کے علاوہ یہاں ہماری ملاقات شیخ محمد صادق مجددی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، جو ملّا صاحب شور بازار کے بھائی ہیں اور ایک عرصہ تک مصر میں افغانستان کے سفیر رہ چکے ہیں، لیکن ہوا یہ کہ ان کے بیٹے قاہرہ میں رہتے ہوئے شیخ حسن البنا شہیدؒ کی دعوت سے متاثر ہو گئے، چنانچہ ۱۹۵۴ء میں جب مصری حکومت نے اخوان پر سختیاں اور ان کی گرفتاریاں شروع کیں، تو ان کے بڑے بیٹے کو گرفتار کر لیا گیا اور چھوٹے بیٹے کو مصر سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد یہ خود بھی سفارت سے الگ ہو گئے۔

چند سال سے مدینہ منورہ ہی میں مقیم ہیں اور غالباً یہیں مستقل رہائش کا ارادہ رکھتے ہیں۔

البقیع اسی روز عصر اور مغرب کے درمیان ہم مدینہ منورہ کے قبرستان البقیع کی زیارت کے لیے گئے، جو مسجد نبوی سے مشرق کی سمت واقع ہے اور معمولی رفتار سے زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ کا راستہ ہے۔ پہلے بقیع جانے والے کو بہت سی گلیوں سے گزرنا پڑتا تھا، مگر اب حکومت نے مسجد نبوی اور بقیع کے درمیان سیدھی کھلی اور پختہ سڑک بنادی ہے، جس سے بقیع آنا جانا بہت آسان ہوگیا ہے۔ یہ قبرستان بھی جاہلیت کے زمانہ سے اہل مدینہ کا قبرستان چلا آرہا ہے۔ ترکوں کے دَور میں یہاں بہت سی پختہ قبریں اور ان پر خوبصورت قبے بنے ہوئے تھے۔ مگر نجدی حضرات نے شریف حسین کو شکست دیکر جب مدینہ منورہ پر قبضہ کیا، تو یہاں کے اکثر قبے گرادیئے اور قبریں توڑ دیں، لیکن بہرحال مکہ معظمہ کے المعلاۃ کی نسبت یہاں پختہ قبروں کی تعداد اب بھی زیادہ ہے۔

مدینہ سے العلا کو روانگی مدینہ کے گورنر اور شہر کے پولیس سپرنٹنڈنٹ کی مہربانی سے ہم کو مدینہ سے آگے کا سفر کرنے کے لیے موٹر بہت اچھی اور بہت مناسب کرایہ پر مل گئی تھی۔ ۱۹ دسمبر کی صبح پہلے ہم نے الوداعی سلام کے لیے روضۂ پاک پر حاضری دی۔ پھر مدینہ سے چلتے ہوئے ان دونوں حضرات سے مل کر اور ان کا شکریہ ادا کرکے دوپہر کے قریب العلاء (جس کا قدیم نام وادی القریٰ تھا) کے لیے روانہ ہوگئے۔

اعلان: اس قسط کے بعد ترجمان القرآن میں اس روداد کی اشاعت ختم کی جاتی ہے کیونکہ مدینہ منورہ سے بعد کی روداد مختصر طور پر ان دو خطوط میں آچکی ہے جو ہم نے سفر کے دوران عمان اور کویت سے روانہ کیے تھے اور جو ترجمان القرآن جنوری و فروری ۱۹۶۰ء میں شائع ہوچکے ہیں۔ اب اس پوری روداد کو انشاء اللہ جلد از جلد کتابی شکل میں لانے کی کوشش کی جائے گی۔ (م-ع)

تعارفِ کتب

مشکوٰۃ المصابیح کا انگریزی ترجمہ (حصہ اول، مع تشریحی نوٹس) از پروفیسر جیمز رابسن ڈاکٹر آف لٹریچر، ڈاکٹر آف ڈویٹی، سابق پروفیسر عربی ادب مانچسٹر یونیورسٹی۔

شائع کردہ: شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور (پاکستان) قیمت چار روپے صفحات ۲۶۴

اسلامی علوم کو مغربی زبانوں میں منتقل کرنے کا رجحان یوں تو بہت پرانا ہے، لیکن اس کام کی رفتار گزشتہ چند سالوں میں غیر معمولی طور پر تیز ہوگئی ہے۔ اس کے متعدد محرکات ہیں، جن میں سے ایک بڑا محرک یہ ہے کہ مسلم قوم کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے اُس کے ذہنی پس منظر کا سمجھنا انتہائی ضروری ہے اور یہ چیز اسلامی علوم خصوصاً قرآن وحدیث کے جانے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ پچھلے دنوں سُنا تھا کہ انگریزی زبان میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب پکتھال کا انگریزی ترجمۂ قرآن ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اہلِ مغرب مسلمانوں کو سمجھنے کے لیے اس کتابِ پاک کو پڑھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ یہی محرک حدیث کے تراجم کا بھی ہے۔

زیرِ نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ فاضل مترجم برسوں عربی زبان وادب کے استاد رہے ہیں اور انہوں نے یہ کام بڑی محنت سے سرانجام دیا ہے۔ اس ترجمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مشکوٰۃ کے جس قدر نسخے ممکن تھے حاصل کیے، حدیث کی متداول کتابوں کی مختلف شرحوں کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد اس کتاب کے ترجمہ کا کام شروع کیا۔ وہ نہ صرف عربی کے استاد ہیں، بلکہ عیسائی مذہب کے ایک نامور فاضل بھی ہیں۔

کتاب کے مطالعہ کے دوران میں جو غلطیاں ہمارے سامنے آئی ہیں انہیں ہم ذرا تفصیل کے ساتھ یہاں پیش کرتے ہیں:

پہلی بات جو اس کتاب میں طبیعت پر گراں گزرتی ہے وہ ہر جگہ حضور سرورِ کائنات

کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو نظر انداز کرنا ہے۔ جب یہ کتاب مشکوٰۃ کا ترجمہ ہے تو جہاں مشکوٰۃ میں حضور کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ آئے ہیں وہاں دیانتداری کا تقاضا یہ تھا کہ ان الفاظ کا ترجمہ بھی درج کیا جاتا۔ مترجم نے یہی سلوک صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی کے ساتھ بھی کیا ہے۔ مترجم کا یہ "سہو" تو سمجھ میں آسکتا ہے مگر ناشر اگر ذرا توجہ دیتے تو ان الفاظ کو بغیر کسی کاوش کے بڑھایا جا سکتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقائے کار رضی اللہ عنہم کے ساتھ ایک مسلمان کا جو تعلقِ خاطر ہے اس پر یہ چیز سخت گراں گزرتی ہے۔ یہ عربی کی کسی عام کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ حضورؐ کے ارشاداتِ عالیہ اور ان کے افعال کے مستند ریکارڈ کا ترجمہ ہے اس لیے اس میں غیر معمولی توجہ اور محنت درکار تھی۔

اس ترجمے کو دیکھ کر ایک قاری کو اس بات کا بھی صحیح طور پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ محض لغت ترجمہ کے معاملے میں کتنی عاجز ہے۔ جو لوگ صرف لغت پر اعتماد کر کے کسی عبارت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس کے مفہوم کو کبھی صحیح طور پر ذہن نشین نہیں کر سکتے۔ اور لغت پر اس بے جا اعتماد سے بسا اوقات ایسی عجیب و غریب غلطیاں ہو جاتی ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً صفحہ ۶۶ پر کتاب الطہارت کی ایک حدیث کا ترجمہ اسی لغت کی وجہ سے مضحکہ خیز بن گیا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں استقیموا ولن تحصوا۔ مطلب یہ ہے کہ "راہِ راست پر چلو، اگرچہ راست روی کا پورا پورا حق تم ادا نہیں کر سکتے" مگر فاضل مترجم نے صرف لغت پر انحصار کرتے ہوئے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے "تم راہِ راست پر رہو، شمار نہ کرتے ہوئے" اس لفظی ترجمے نے لن تحصوا کی ساری معنویت کو غارت کر دیا ہے۔

یوں تو پورا ترجمہ ہی مجموعۂ اغلاط ہے اور عربی لغت اور قواعد اور محاورات کو سمجھنے میں مصنف نے جگہ جگہ سخت ٹھوکریں کھائی گئی ہیں مگر ہم یہاں صرف چند مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں تاکہ

آپ کو اندازہ ہو سکے کہ جن مستشرقین پر ہمیں اتنا اعتماد ہے ان کے فاضل ترین افراد کو بھی اسلامی علوم میں کتنی دسترس حاصل ہے۔

کتاب الایمان میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں یہ عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! آگ سے نجات کا ذریعہ کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا:

من قبل منی الکلمۃ التی	جو کلمہ میں نے اپنے چچا کے سامنے پیش کیا تھا
عرضت علی عمی فردّھا فھی لہٗ	اور انہوں نے اسے رد کر دیا تھا اس کلمے کو
نجاۃ۔	جس شخص نے قبول کر لیا اس کے لیے نجات ہے۔

اس میں لفظ فردّھا (جس کو ابوطالب نے رد کیا تھا) کا ترجمہ فاضل مترجم نے "دہرایا ہے" AND REPEATS IT کیا ہے، یعنی "جو شخص وہ کلمہ قبول کر لیتا ہے اور اسے بار بار دُہراتا ہے وہ نجات پا جائے گا۔" صہ۵

اسی کتاب الایمان میں دوسری جگہ مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

یا رسول اللہ! بابی انت وامی	میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔

یہ سیدھا سا ترجمہ ہے، اسے فاضل مترجم نے یوں بیان کیا ہے: "آپ مجھے اتنے ہی پیارے ہیں جتنے کہ میرے والدین" صہ۱۴

یہاں متن اور ترجمہ میں بہت فرق ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں آپ پر اپنے ماں باپ بھی قربان کر دوں اور مترجم کہتے ہیں کہ آپ اور میرے والدین میری نظر میں برابر ہیں۔ غالباً مترجم نے "بابی" کی ب کا مفہوم نہیں سمجھا۔

اسی نوعیت کی ایک اور غلطی ملاحظہ فرمائیں۔ صاحبِ مشکوٰۃ کتاب الایمان فصل ثانی میں ترمذی اور نسائی سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت المسلم من سلم المسلمون

من لسانہ و یدہ ۔ ۔ ۔ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں " وزاد البیہقی فی شعب الایمان بروایۃ فضالۃ "والمجاھد من جاھد نفسہ فی طاعۃ اللہ" یعنی بیہقی نے شعب الایمان میں فضالہ کی روایت سے جو حدیث نقل کی ہے اس میں یہ فقرہ زائد ہے کہ "مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کو مجبور کر کے اللہ کی اطاعت میں لگا دے "

فاضل مترجم نے یہاں المجاہد کو ایک راوی کا نام سمجھ کر اس کا ترجمہ یوں کر دیا ہے :۔

"اور بیہقی نے شعب الایمان میں فضالہ اور المجاہد کی روایت سے یہ الفاظ بڑھائے ہیں " ص ۱۲

انہوں نے اس بات پر بھی غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ حدیث کے پہلے حصے میں "المسلم" اسم فاعل آیا ہے اور پھر اس کے ساتھ اس کا فعل سلم آیا ہے ، اس کے بعد المومن اسم فاعل آیا ہے اور ساتھ ہی اس کا فعل امن بھی موجود ہے ۔ بالکل اسی طرح المجاھد اسم فاعل کے ساتھ اس کا فعل جاھد بھی لگا ہوا ہے ۔ اور انہوں نے اسم فاعل کو راوی کا نام سمجھ لیا ہے ۔

اسی کتاب الایمان کی فصل ثالث میں عمرو بن علبسہ کی روایت ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا عبادت کے اوقات میں کون سا وقت افضل ہے تو آپ نے فرمایا : جوف اللیل الاخر یعنی " رات کا آخری نصف " یہاں لفظ آخر جوف کی صفت ہے اور اس کی تصریح حواشی میں موجود ہے ۔ قولہ الآخر صفۃ جوف ۔ ای النصف الآخر من اللیل ۔ مگر فاضل مصنف نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے "رات کے تاریک ترین حصہ کا آخر"

اسی کتاب الایمان میں حضرت ابو ذرؓ کی روایت ہے ۔

اُتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعلیہ ثوب ابیض وھو نائم " یعنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ سفید چادر اوڑھے سو رہے تھے ۔ فاضل مترجم نے سیاق و سباق پر غور کیے بغیر علیہ ثوب ابیض کا مطلب یہ سمجھا کہ حضور اس وقت سفید لباس زیب تن کیے ہوئے تھے ۔ ص ۱۱

اسی طرح باب الکبائر میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے جس میں حضور نے منافق کی چار نشانیاں بتائی ہیں۔ ان میں سے آخری نشانی یہ ہے واذا خاصم فجر یعنی "وہ جب جھگڑا کرے تو گالیوں پر اتر آئے"۔ اس کا ترجمہ بڑا ہی عجیب و غریب کیا گیا ہے۔ یعنی "وہ جب عدالت میں جائے تو حق و صداقت کے راستے سے ہٹ جائے"۔ ص۱۸

باب الایمان بالقدر کی فصل ثانی میں ابوخزامہ کی حدیث ہے کہ ان کے والد نے حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہ جو جھاڑ پھونک اور دوا وغیرہ ہم کرتے ہیں کیا اس سے تقدیر کو ٹالا جا سکتا ہے؟ اس حدیث کا آخری حصہ ہے "وتقاۃ نتقیھا" یعنی دشمن یا بیماری یا آفات سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے جو تدبیریں ہم کرتے ہیں"۔ مترجم نے اس فقرے میں لفظ تقاۃ کو تقویٰ سمجھ لیا ہے اور اس کا ترجمہ یہ کر دیا کہ

"وہ پرہیزگاری جس پر ہم عمل کرتے ہیں"۔ ص۲۸

ص۷۶ پر حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی یہ روایت آئی ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سب سے بڑا سخی اللہ تعالیٰ ہے، پھر نوع بشری میں سب سے زیادہ سخی میں ہوں، اور میرے بعد سب سے زیادہ سخی وہ شخص ہے جو علم حاصل کرتا ہے اور اس کی نشر و اشاعت کرتا ہے"۔ پھر آپ نے یہ الفاظ فرمائے: یاتی یوم القیمۃ امیرا وحدہ۔ فاضل مترجم نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"HE WILL COME AS A PRINCE ALONE"

اس جگہ مترجم نے محض لفظی ترجمہ کر دیا ہے جس سے مطلب ادا نہیں ہوا۔ یہاں حضور نے دراصل وہی بات فرمائی ہے جو آج کل ہم کسی شخص کی تعریف میں کہتے ہیں کہ وہ اپنی ذات سے ایک ادارہ ہے۔ حضور کا مدعا یہ ہے کہ قیامت کے روز وہ شخص پوری ایک جماعت کی صورت میں آئے گا جس میں ایک امیر ہوتا ہے اور بہت سے اس کے تابع ہوتے ہیں۔

اسی باب کی ایک اور روایت کا مفہوم سمجھنے میں فاضل مترجم نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔

حضرت حذیفہ کے قول "یا معشر القراء استقیموا ۔۔۔۔ الخ" کا ترجمہ انہوں نے یہ کیا ہے کہ "قرآن پڑھنے والو! اگر تم سیدھی راہ چلو گے تو بہت سبقت لے جاؤ گے۔ لیکن اگر تم دائیں یا بائیں مڑ جاؤ گے تو سخت گمراہی میں پڑ جاؤ گے" (صفحہ ۶۲)۔ حالانکہ دراصل حضرت حذیفہؓ اپنے زمانے کے قارئین قرآن سے جو بات اس فقرے میں کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ تم سیدھے چلو کیونکہ تمہیں پہلے ہی دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں بڑی سبقت (یعنی سبقت فی الاسلام) حاصل ہے۔ اگر تم دائیں بائیں مڑو گے تو گمراہی میں بہت دور نکل جاؤ گے۔ یعنی دوسروں کی بہ نسبت تمہاری گمراہی زیادہ شدید قرار پائے گی۔

ص ۴۶ پر حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت منقول ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "ہم یہود سے ایسی باتیں سنتے ہیں جو ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک یہ درست ہوگا کہ ہم انہیں قلمبند کر لیا کریں"۔ اس کے جواب میں حضور نے جو کچھ فرمایا اس کا ایک فقرہ یہ ہے۔

لقد جئتکم بها بیضاء نقیۃ — میں تمہارے لیے اس شریعت کو صاف اور روشن حالت میں لیکر آیا ہوں۔

فاضل مترجم نے اس کا ترجمہ کیا ہے: "I HAVE BROUGHT THEM TO YOU WHITE AND PURE"۔ اس ترجمے میں اوّل تو لفظ "THEM" بالکل مہمل اور بے معنی ہے۔ پھر بیضاء کا ترجمہ "WHITE" محض مکھی پر مکھی مارنے کے مترادف ہے۔

ضمائر کے مرجع متعین کرنے میں مترجم نے بکثرت مقامات پر ٹھوکر کھائی ہے۔ اسی طرح معروف اور مجہول کے معاملے میں بھی ان سے متعدد فروگذاشتیں ایسی ہوئی ہیں جن سے مفہوم بالکل بدل جاتا ہے۔

کتاب کے مطالعہ کے بعد ایک قاری کے ذہن میں یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب نے انگریزی کے لیے موزوں الفاظ تلاش کرنے میں اتنی کاوش نہیں کی ہے جو فی الواقع

اس قسم کے کام کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً انہوں نے اعرابی (ص ۳) کا ترجمہ بڑی بے تکلفی سے عرب ARAB کر دیا ہے۔ حالانکہ ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی جانتا ہے کہ قرآن مجید اور احادیث میں جہاں لفظ اعرابی آتا ہے وہاں اس سے مراد عرب کا شہری نہیں بلکہ بدوی ہے۔ صفحہ ۹ پر صمد کا ترجمہ ابدی (ETERNAL) اور ص ۲۲ پر بلیغۃ کا ترجمہ طویل (LENGTHY) بھی کسی طرح موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ یہ صرف چند نمایاں فروگزاشتیں ہیں جو سرسری مطالعہ سے سامنے آئی ہیں۔ اگر مزید غور سے دیکھا جائے تو بعید نہیں کہ غلطیاں زیادہ بھی پائی جائیں اور شدید بھی۔ اس سے پہلے حصے میں جو اس وقت پیش نظر ہے صرف کتاب الایمان، کتاب العلم اور کتاب الطہارۃ کا ترجمہ درج ہے۔ آغاز میں ۲۴ صفحات پر پھیلا ہوا مقدمہ بھی شامل ہے جس میں علم حدیث کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

کتاب کا معیارِ طباعت اچھا ہے اور شیخ محمد اشرف کے طباعتی ادارہ کے ہر لحاظ سے شایانِ شان۔ البتہ بعض مقامات پر پروف پڑھنے میں وہ احتیاط نہیں برتی گئی جو فی الواقع اس نوعیت کی کتابوں میں ضروری ہوتی ہے۔

ایک ضروری اعلان

ہم نے اس امر کا اہتمام کیا ہے کہ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، مکتبہ چراغ راہ، مکتبہ تعمیرِ انسانیت اور دوسرے اسلامی لٹریچر شائع کرنے والے اداروں کی کتب دفتر ترجمان القرآن سے بھی ضرورت مند حضرات کو مل سکیں۔ قارئین کرام اپنی ضرورت کے مطابق آرڈر بھیج سکتے ہیں۔

مینیجر شعبۂ کتب، ادارہ ترجمان القرآن

اچھرہ، لاہور

مطبوعات

اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں | مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ طابع و ناشر: صدق جدید بک ایجنسی، کچہری روڈ، لکھنؤ (بھارت)، قیمت دو روپے ۲۵ نئے پیسے، صفحات ۲۵۷۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے قرآن مجید کی انگریزی اور اُردو تفاسیر کے کام سے فارغ ہو کر قرآن مجید کے بعض دوسرے پہلوؤں کی طرف توجہ فرمائی ہے اور ان کے متعلق نہایت مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ زیرِ تبصرہ رسالہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں فاضل مؤلف نے حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق ان تمام اسماء اور اعلام کی ایک فرہنگ مرتب کی ہے جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ نیز ان شخصیتوں کو بھی لے لیا ہے جن کا ذکر کنایۃً کیا گیا ہے۔ یہ شخصیتیں انسانی بھی ہیں جیسے آدم، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، فرعون، قارون وغیرہ۔ اور غیر انسانی بھی مثلاً جبریل، میکائل، ابلیس، لات، مناۃ وغیرہ۔ ہر شخصیت کے ساتھ اُس کا حوالہ بہ قیدِ سورۃ و رکوع موجود ہے اور اس کے متعلق مستند معلومات بھی درج کی گئی ہیں۔

یہ کتاب پاکستان میں کہاں مل سکتی ہے اس کے متعلق کوئی تصریح موجود نہیں۔

رسولؐ اور سنتِ رسولؐ قرآن اور عقلِ سلیم کی روشنی میں | از مولانا ابو السلام نعیم صدیقی صاحب۔ طابع و ناشر: مکتبہ تعمیرِ انسانیت موچی دروازہ، لاہور۔ صفحات ۲۶۹ قیمت قسم اوّل چار روپے چار آنے قیمت عام قسم تین روپے چار آنے۔

جناب نعیم صدیقی صاحب نے اس کتاب میں نہایت محکم دلائل سے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ رسول کی حیثیت دنیا میں محض ایک نامہ بر کی نہیں ہوتی بلکہ وہ اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ لوگ اپنی پوری زندگی میں اس کی اطاعت اور پیروی کریں۔ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ساری نوعِ انسانی کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ اور اُن کی یہ حیثیت اُن کی زندگی

تک ہی محدود نہیں بلکہ قیامت تک وہ انسانیت کے ہادی ہیں۔ نعیم صدیقی صاحب نے جہاں اس موضوع پر ایک مثبت نقطۂ نظر سے بحث کی ہے وہاں انہوں نے منکرینِ حدیث کی پھیلائی ہوئی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے۔ ہم اس مفید اور معلومات افزا کتاب کے پڑھنے کی پُر زور سفارش کرتے ہیں۔ (ع - ح - ص)

ننھے منّوں کی دنیا | ایڈیٹر صوفی عبدالعزیز ایم۔ اے۔

مقامِ اشاعت: ۲۲۱ سرکلر روڈ، لاہور۔ سالانہ چندہ تین روپے۔ فی پرچہ چار آنے۔

یہ بچوں کا ایک رسالہ ہے جو ملک کے ایک ذی علم اور بزرگ استاد پروفیسر عبدالعزیز صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ پرچہ میں دینی رجحان غالب ہے۔

خدا موجود ہے | یہ کتاب امریکہ میں شائع شدہ ایک تالیف "پھیلتی ہوئی کائنات میں خدا کی شہادت" کا ترجمہ ہے جو مکتبہ فرینکلن پوسٹ بکس ۳۶۹ لاہور اور مکتبۂ افکار اسلامی، زیر مسلم مسجد، انارکلی لاہور کے باہمی اشتراک سے اشاعت پذیر ہوا ہے۔ مترجم پروفیسر عبدالحمید ایم۔ اے ہیں۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت ساڑھے چھ روپے۔ کتاب کے آغاز میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے قلم سے چھبیس صفحات کا مقدمہ ہے۔

اس کتاب میں چالیس مختلف اور ممتاز سائنس دانوں کے مضامین جمع کیے گئے ہیں جن میں انہوں نے اس مسئلے پر بحث کی ہے کہ اپنے اپنے شعبۂ علم وفن میں انہیں وجود باری تعالیٰ کے حق میں کیا کیا دلائل وشواہد فراہم ہوئے ہیں اور کس طرح انہیں عقلی و ذہنی اطمینان حاصل ہوا ہے کہ یہ کائنات ازلی و ابدی نہیں ہے، نہ آپ سے آپ وجود میں آگئی ہے، بلکہ اسے ایک قادرِ مطلق نے پورے شعور و ارادہ اور حکمت کے ساتھ ایک وقتِ معین پر خلق کیا تھا اور وہی خالق اس کی تدبیر امر کر رہا ہے۔ پھر ایک وقت لازماً ایسا آئے گا جبکہ یہ نظامِ کائنات جو ابدی نہیں ہے، درہم برہم ہو جائے گا

ان مضامین کے لکھنے والوں میں کیمیا، طبیعیات، طب، ریاضی، فلکیات، غرض ہر طرح کے

تجرباتی اور مشاہداتی علوم کے ماہرین موجود ہیں۔ بلاشبہ ان کے بعض ضمنی مباحث مسیحی عقائد کے بھی مرہونِ منت ہیں، لیکن مجموعی اور اصولی اعتبار سے ان مباحث کا مواد اور استدلال نہایت محکم، تسلی بخش اور یقین آفرین ہے اور صرف، وہی شخص اس سے منہ موڑ سکتا ہے جو تعصب اور ہٹ دھرمی کی بنا پر اللہ کو نہ ماننے کی قسم کھا چکا ہو۔

جو لوگ جدید ترین انکشافات سے پورے طور پر بہرہ مند نہیں ہوتے اور جو گذشتہ صدی میں مذہب و سائنس کی خیالی معرکہ آرائی کا حال دور دور سے سن کر دین سے برگشتہ ہو رہے ہیں، ان لوگوں کے لیے یہ کتاب انشاء اللہ خاص طور پر مفید ہو گی۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ کی ذات اور اس کی صفات کا کامل تصور اور راسخ علم اُس کے رسولوں ہی کی وساطت سے ملتا ہے، تاہم انفس و آفاق میں بھی بے شمار ایسی آیات "(نشانیاں) موجود ہیں جو خالقِ کائنات کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہی ہیں اور ان پر تدبّر کی دعوت خود اللہ اور اُس کے رسولوں نے دی ہے۔ علم و دانش کے نام پر من گھڑت نظریات سے اپنی توجہ ہٹا کر ایک مردِ مومن اگر علمِ کائنات کے متعلق فراہم کردہ خالص حقائق پر غور و فکر کرے تو اس سے ایمان میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا ہے اس لیے ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ قارئین کے لیے طمانیتِ قلب کا موجب ہو گا۔

ترجمہ شستہ اور کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ البتہ کہیں کہیں اغلاط ہیں جن میں سے بعض تکلیف دہ بھی ہیں، مثلاً صفحہ ۲۲ کی پہلی سطر ہے: "اس بنا پر لاادریت بھی عملی طور پر خدا کے مساوی ہو جاتی ہے۔" یہاں "انکار" کا لفظ چھوٹ گیا ہے۔

صفحہ ۲۶۵ کی چوتھی سطر یوں ہے:-

"وہ خدا رب العالمین بھی ہے اور اشرف المخلوقات بھی یعنی انسان سے بھی گہرا تعلق رکھتا ہے۔"

یہاں اشرف المخلوقات کے بعد "بھی" کا لفظ زاید ہے جس نے پورے فقرے کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

امید ہے کہ آئندہ اڈیشن ایسی غلطیوں سے پاک ہوگا۔ (غلام علی)

تعصب، عدم رواداری اور اسلام (زبان انگریزی) | تالیف پروفیسر خورشید احمد صاحب، ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی۔ شائع کردہ: اسلامک پبلیکیشنز۔ ۱۱۔سی شاہ عالم مارکیٹ، لاہور۔ قیمت ایک روپیہ، صفحات ۵۳۔

فاضل نوجوان پروفیسر خورشید احمد صاحب نے گزشتہ چند سالوں میں علمی میدان میں اسلام کی جو بیش قیمت خدمات سرانجام دی ہیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اسی قسم کی کوششوں میں "منیر رپورٹ کا تجزیہ" کا انگریزی ترجمہ ہے۔

اس ترجمے کے آغاز میں انہوں نے ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں انہوں نے ناقابل تردید دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ اہلِ مغرب اسلام پر جو تعصب اور عدم رواداری کا الزام لگا رہے ہیں وہ بالکل بے بنیاد اور لغو ہے۔ وہ یہ کام صرف اپنے مجرم ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ اسی مقدمہ میں انہوں نے متعدد اضافے کرنے کے بعد اسے زیرِ نظر مقالے کی صورت دی ہے۔ یہ قیمتی مقالہ ۹ عنوانات پر مشتمل ہے جن میں چند قابلِ ذکر یہ ہیں، لادینی اور تعصب۔ یورپ اور امریکہ میں "رواداری" کے "کرشمے"۔ اہلِ مغرب کا دوسری تہذیبوں کے متعلق معاندانہ رویہ۔ اسلامی رواداری اور غیر دینی رواداری کا باہمی موازنہ، "سائنس اور رواداری"۔ عہدِ حاضر میں آزادی، اسلام اور رواداری۔ ان سارے مباحث میں انہوں نے اہلِ مغرب کے مفکرین کو ہی بطورِ گواہ پیش کیا ہے اور اُن کے بیانات کی تائید سے ثابت کیا ہے کہ دنیائے مغرب میں اس وقت جس قسم کا تعصب پایا جاتا ہے وہ بڑا ہی انسانیت سوز ہے۔ آخر میں انہوں نے نہایت جچے تلے انداز میں بڑے اختصار کے ساتھ رواداری کے متعلق اسلامی موقف کو بھی ظاہر فرمایا ہے۔ یہ کتابچہ بڑا معلومات افزا ہے

اسلامک پبلیکیشنز نے اسلامی کتب کی طباعت اور اشاعت کے لیے جو بلند معیار قائم کیا ہے

اس کتابچہ کو ہر لحاظ سے اس کی جیتی جاگتی تصویر کہا جا سکتا ہے۔

حجۃ المصطفیٰ تالیف محب الدین طبری المتوفی سنہ ۶۹۴ھ۔ ترجمہ و تلخیص مولانا محمد جیلانی صاحب
صفحات ۶۳۔ ناشر ادارہ المجلس، نور بھائی بلڈنگ بندر روڈ، کراچی۔

ادارہ "المجلس" مفید عربی کتب کو اردو میں منتقل کرنے کا جو کام سرانجام دے رہا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ زیر نظر رسالہ اسی سلسلہ کی ایک نہایت اہم کڑی ہے۔ اس رسالہ کے مصنف ساتویں صدی ہجری کے مشہور محدث اور امام محب الدین الطبری ہیں۔ اس میں انہوں نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مبارک کے واقعات کو مستند اور صحیح احادیث کی روشنی میں مرتب کیا ہے اور اب اسے مولانا محمد جیلانی صاحب نے اردو کے قالب میں ڈھالنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ فاضل مترجم کی نہ صرف زبان شستہ اور رواں ہے، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں تلخیص کے معاملے میں بھی خاصی مہارت ہے۔ ترجمہ پر نظر ثانی اسلام کے مشہور خادم اور محقق ڈاکٹر حمید اللہ نے فرمائی ہے جو اس کی صحت کی زبردست دلیل کہی جا سکتی ہے۔

کتابت اور طباعت کا معیار بھی عمدہ ہے۔

ماہنامہ حاذق مدیر: حکیم حبیب اشعر صاحب۔ زر سالانہ چار روپے۔ فی پرچہ: چھ آنے
صفحات: ۴۸۔ مقام اشاعت: ۲ میو ہسپتال مینشن چوک رنگ محل۔ لاہور

یہ ایک طبی پرچہ ہے جو ملک کے مشہور ادیب اور مترجم حکیم حبیب اشعر صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اس پرچے کا اصل مقصد طب یونانی کے متعلق لوگوں کو مفید معلومات فراہم کرنا ہے، لیکن چونکہ اس کے مدیر نہایت ستھرا ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں اس لیے اس کی جھلک بھی ہر پرچے میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ جو لوگ طب یونانی کو ادبی چاشنی کے ساتھ پڑھنا چاہتے ہیں وہ اس میں اپنے ذوق کی پوری طرح تسکین کر سکتے ہیں۔

(بقیہ اشارات)

سورۃ منافقون میں خود مسلمانوں کو مال و دولت سے اس طرح ڈرایا کہ دیکھو!

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ۔	اے ایمان والو! تمہارے اموال و اولاد کہیں تمہیں خدا کی یاد سے غافل نہ کردیں اور جو ایسا کریں گے وہ گھاٹے ہی میں رہنے والے ہوں گے۔

ایک دوسرے مقام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے اس امر کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے کہ مال و متاع کی یہ فراوانی اگر غلط ہاتھوں میں ہو تو وہ نہ صرف اُس شخص کے لیے وبالِ جان بنتی ہے بلکہ اس کے ذریعے غلط کار لوگوں کے اندر گمراہی پھیلتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یہی مال لوگوں کو بہکانے اور راہ راست سے ہٹانے کا ایک موثر ذریعہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے اس مال کی بربادی اصلاحِ حال کے لیے از حد ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑی دلسوزی کے ساتھ رب العزت کی بارگاہ میں کہتے ہیں:

رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ۔ (یونس - ۸۰)	پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے۔ اے رب! کیا وہ اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں۔ اے رب اُن کے مال غارت کردے۔

شیطان کو جب اولادِ آدم کے گمراہ کرنے کی مہلت ملی تو اس گمراہی کے ذرائع میں اولاد کے ساتھ دنیاوی مال و متاع کا ذکر خصوصیت سے فرمایا کیونکہ گمراہی کی جس قدر راہیں ممکن ہیں ان میں مال کی راہ سب سے زیادہ پر فریب ہے۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (بنی اسرائیل - ۷)

تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے، ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا، مال و اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا، اور اُن کو وعدوں کے جال میں پھانس ــ اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا اور کچھ نہیں۔

قرآن مجید کے علاوہ حدیث میں بھی دولت کے اسی پہلو کے متعلق بہت سی تصریحات ملتی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی سلسلہ میں ایک مشہور دعا مروی ہے:

اَعُوْذُ بِكَ مِنْ مَالٍ يَكُوْنُ عَلَيَّ عَذَابًا۔

(اے اللہ) میں تیری پناہ چاہتا ہوں ایسے مال سے جو میرے لیے عذاب ہو جائے۔

اسی طرح بخاریؒ کی ایک حدیث میں بطور بد دعا زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے

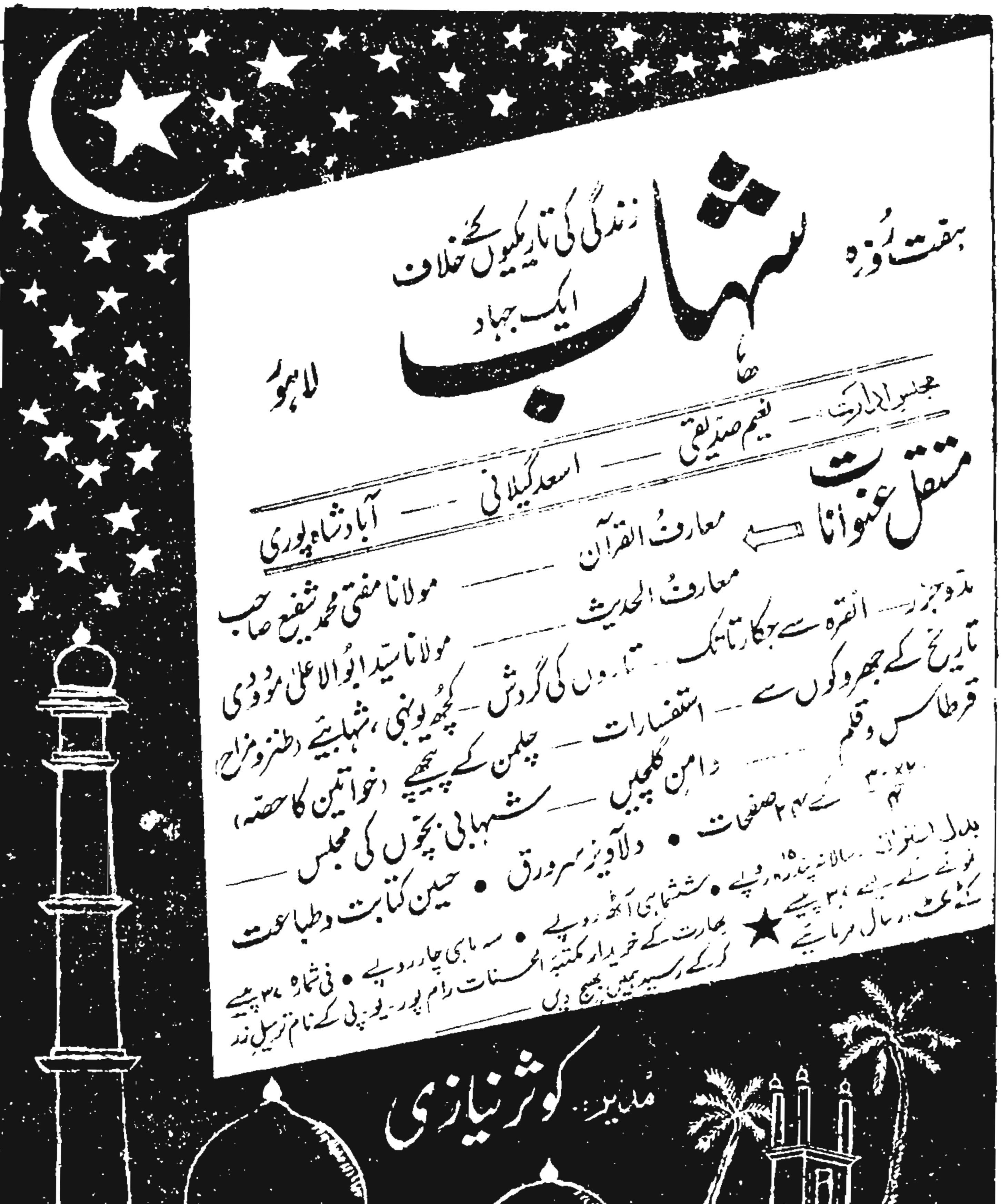
تعس عبد الدینار و الدراھم — ہلاک ہو بندۂ درہم و دینار

ایک دوسرے موقع پر حضور سرور کائنات نے دولت کی انہی ہلاکت خیزیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"میں جس بات سے تم پر اپنے بعد ڈرتا ہوں وہ دنیا کی سرسبزی اور شادابی اور آرائش کے دروازوں کا تم پر کھل جانا ہے۔"

اسی مطلب کو ترمذی میں کعب بن عیاضؓ نے اس طرح روایت کیا ہے:

"ہر امت کے لیے کوئی نہ کوئی فتنہ رہا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔"


ہفت روزہ
شہاب
زندگی کی تاریکیوں کے خلاف
ایک جہاد
لاہور
مجلس ادارت — نعیم صدیقی — اسعد گیلانی — آباد شاہ پوری
مستقل عنوانات
معارف القرآن — مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
معارف الحدیث — مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
تاریخ کے جھروکوں سے — استفسارات
کچھ یونہی، شہابیے (طنز و مزاح)
چلمن کے پیچھے (خواتین کا حصہ)
قرطاس و قلم — دامن گلچیں
شہابی بچوں کی مجلس
صفحات • دلآویز سرورق • حسین کتابت و طباعت
بدل اشتراک سالانہ پندرہ روپے • ششماہی آٹھ روپے • سہ ماہی چار روپے • فی شمارہ ۳۰ پیسے
بھارت کے خریدار مکتبہ الحسنات رام پور کے نام ترسیل زر کرکے رسید ہمیں بھیج دیں
مدیر: کوثر نیازی
ہفت روزہ شہاب • شاہ عالم مارکیٹ • لاہور

تنقیحات
۱

اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم سے
پیدا شدہ مسائل پر بصیرت افروز تبصرے

سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ کراچی - لاہور

تنقیحات

سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
کراچی -- لاہور

نادر القلم